اڈیٹر

ابو الشمس سید ظفر عباس فضا لکھنوی

نظارہ لکھنؤ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ (۸؍) — چندہ سالانہ تین روپیہ آٹھ آنہ (۳؍۸)

عید نمبر

جلد ۱ — بابت ماہ جنوری و فروری سنہ ۱۹۳۱ء — نمبر ۸ و ۹

(۱) ہر ماہ انگریزی کے چوتھے ہفتہ دار السلطنت اودھ (لکھنؤ) سے شایع ہوتا ہے۔

(۲) چندہ سالانہ والیان ملک سے سو روپیہ راجگان سے پچاس روپیہ شاہزادگان و تعلقداران سے پچیس روپیہ۔ رؤسا سے پانچ روپیہ عام خریداروں سے تین روپیہ آٹھ آنہ (عہ/۳) ششماہی دو روپیہ (عہ/)

(۳) نمونہ کا پرچہ ۱/ کے ٹکٹ آنے پر روانہ ہوتا ہے۔

(۴) تمام ترسیل زر بنام منیجر نظارہ ہونا چاہیے۔

نرخنامہ اشتہارات

تعداد	پورا صفحہ	نصف صفحہ	چوتھائی صفحہ
ایک سال	[illegible]	[illegible]	[illegible]
چھ ماہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
تین ماہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ایک مرتبہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نوٹ:- نظارہ اردو کثیر الاشاعت رسالہ ہے اسکی اشاعت سے ہندوستان کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے ٹائٹل کے اشتہارات کیلئے قیمت مندرجہ بالا سے آٹھواں حصہ قیمت کا زائد لیا جائیگا۔ نرخنامہ میں کمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اسلئے کمی کی خواہش بیکار ثابت ہوگی۔ قیمت بہرحال پیشگی ہوگی۔

المشتہر:- سید محمود حسین تابش منیجر نظارہ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

نظارہ لکھنؤ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ (۸؍)
چندہ سالانہ تین روپیہ آٹھ آنہ (۳/۸)

عید نمبر

جلد ۱ — بابت ماہ جنوری و فروری سنہ ۱۹۳۱ء — نمبر ۸ و ۹

شذرات

تنقیح ۱۹۵۹

عید مبارک مسلمانون کی عید بعد الرمضان وہ عید ہی جسے ہم چاہی عید الفطر کہہ لین چاہی عید نوروز کیونکہ ہمارا سال نو محرم سے شروع ہوتا ہی جسکی خوشی کو " ذبح عظیم " نے غم سے بدل دیا - اب رہی سہی یہی ایک عید ہی جو تمام عیدون سے اہم سمجھی جاتی ہی اور سال نو شروع ہونے کے بعد سب سے زیادہ مسلمانان عالم اسی مین دلچسپی لیتے ہین سب سے زیادہ عالم اسلام مین اسی کی چہل پہل ہوتی ہی جس طرح رمضان مبارک کو خدا سے نسبت ہے اسی طرح عید مبارک کو بھی خدا سے نسبت ہے پھر سال مین ایک مرتبہ اپنی نوعیت کا نیا دن لیکے آتی ہی - اسلئے ہمارے واسطے عید نوروز بھی یہی عید ہوسکتی ہی - اسی بنا پر ہمنے بھی جنوری و فروری کے یکجائی نمبر کو اسی عید سے نسبت دیکے مبارک بنایا ہی تاکہ " نظارہ " بھی لباس عید مین اپنے خریدارون کی دست بوسی کرے اور ہماری طرف سے " مبارکباد " کہے - حالانکہ جیسا ہم چاہتے تھے اس طرح اسکو کامیاب بنا سکے جسکی آئندہ تلافی کردی جائے گی -

---

ہمارے بعض احباب نے (جن کو نیاز صاحب فتحپوری سی بھی نیاز حاصل ہی) ہمکو نصیحت فرمائی ہی کہ ہم نظارہ کی پالیسی کو بدلدین اور جس رخ پر نظارہ اس وقت گامزن ہی اسکو کسی دوسری روش پر چلائین -

مگر افسوس کہ انھون نے ہمارے دلی جذبات کا بالکل لحاظ نہین کیا - اور اُن کی اس نصیحت سے ہمارے دل پر ایک کاری ضرب اور لگی مولانا نیاز صاحب فتحپوری سے ہمکو کوئی ذاتی عداوت نہین ہی - اُن کا تعصب البتہ ہماری رگ دل کیلئے نشتر کا کام کرتا ہی - نگار کے صفحات جتنے دنون ہمارے صبر کی قوت آزماتے رہی اسکا وقفہ کم نہین تھا - ہم اسوقت بھی اسی طرح دندان شکن جواب دیسکتے تھے جس طرح آج دیرہی ہین لیکن تھوڑے زمانہ تک ہم انتظار کرتے رہی کہ مولانا اب رحم کرین اب رحم کرین - اور اب ان غریب شیعون کے جذبات کا لحاظ کرین جو تیرہ سو برس سی ابدعت رونے پر آمادہ ہین اور رہے ہین لیکن مولانا نے اپنا طرز تحریر نہ بدلنا تھا نہ بدلا کبھی حجاج کی ڈائری لکھکر اُن مردہ بادشاہون کو کاہیان دین جو آرام سے اپنی اپنی قبرون مین سو رہی ہین اور کبھی لکھنؤ کی شاعری کے سلسلہ مین ہمارے رونے کو بدعت پر محمول کر دیا کبھی ہماری عورتون کی سینہ زنی پر رنگین الفاظ مین ہجو کی گئی -

الغرض ہمارے دل کو چھلنی کر دیا اور اب ہم اپنے نفس مین صبر کو مردہ پاتے ہین اور اپنے ان احباب سے کہتے ہین کہ قبل اسکے وہ ہمارے ناصح بنین مولانا نیاز فتحپوری ہی کا رنگ تحریر بدلنے کی کوشش کرین -

" وہ اپنی خو نہ چھوڑین گے ہم اپنی وضع کیون بدلین "

عید کا چاند

از برادرِ معظم لسان الشعرا مولانا شاعر لکھنوی

اے ہلالِ عید اے پیمانۂ افطارِ صوم — اے چراغِ حدِ منزل خاتمِ رفتارِ صوم

اوٹھ نہین سکتا خریدارون سے تیرے بارِ صوم — ہان نقابِ رخ اولٹ اے یوسفِ بازارِ صوم

کم ہین گاہک سرد کیا بازار ہی تیرے لئے
مدہی دنیا زلیخا زار ہی تیرے لئے

روٹی کے ٹکڑے سے زاہد ہی گدا کو تیری چاہ — اپنے ایوان مین ہی مشتاقِ زیارت بادشاہ

میکشون کو اب نہین ہی طاقتِ ضبطِ گناہ — دستِ بیزاری کو ساغر سے ہوا ہی ایک ماہ

تیرے مل جانے سے ہو جائیگی عید میکدہ
پھر لئے ہین میکدہ والے کلید میکدہ

تیرے استقبال مین ہین محو ہند و شام و روم | خشک لب مُلّا کھڑے ہین دیکھ مسجد کا ہجوم

ہی مبارک باد کی ہنستے ہوے بچّون مین دھوم | بیبیان کوٹھون پر آئی ہین کہ گردون پر نجوم

شہر بھر سے طرز ہی شرمیلے پن کا اوٹھ گیا

حسبِ شوقِ دید مین گھونگھٹ دولہن کا اوٹھ گیا

سامنے تیرے کھڑی ہی اک دوشیزہ جوان | جسکے لب شاہد کہ روزہ رکھ چکی انتیسوان [29]

دوسرا آنچل سر پہ زیرِ پیرہن رگ رگ نہان | طائرِ نظّارہ سرگرمِ تلاشِ آشیان

آنکھ کی بجلی مین پنہان ہی کہانی طور کی

نور کے ٹکڑے کو خواہش ہی جمال نور کی

جھٹپٹا وقت، اونچا کوٹھا، جانب مغرب نظر | شام دودی شرق مین گھندار گیسو پشت پر

پہلا تارا اوس طرف، شفّاق آئینہ ادھر | سامنے قرآن ہی والنجم ہو یا والقمر

ماہِ نو گردون پر ابرو کے مقابل ٹھیک ہے

جتنے لب پتلے ہین اوتنا چاند بھی باریک ہے

عید کی دلمین خوشی وزون سی چھٹنے کا گداز ہی دل معصوم اوس کا حامل صد سوز و ساز

شور کہتا ہی اذان کا آگیا وقتِ نماز پی رہی ہی جلد جلد اشکون کو چشمِ نمیاز

اشک اوبلے آتے ہین کیون حال دل تغیر ہی

کہتی ہی تارے نکلنے مین ابھی تاخیر ہے

رنگ اوڑجائے شفق کا وہ ڈوپٹہ لال لال چھپے جاتے ہین ستارے بیر ہین گورے گورے گال

ہائے جذبِ حسنِ کامل ہارتا ہی جمال گو دکھوے آسمان سے اوتر آئے ٹ تا ہے ہلال

جگمگاہٹ عالم علوی کی دل کو ماندہی

خود ہلال عید کہتا ہی یہ میرا چاند ہی

اوس طرف بادل کے ٹکڑے قریب ماہ نو عیان آستین گوری کلائی سے ادھر جلوہ کنان

آلہ دو گلہ اوس طرف گرد و نیر تارے ضو فشان بام خانہ پر ادھر ہنستی ہوئی ہم جولیان

ہی ہلال عید کے خم مین ادا تعظیم کی

کھنچ گئی تصویریان کو جھکے جب تسلیم کی

اس کی آنکھوں سے ملائین آنکھ تارے کیا مجال — ماہ نو گردون پہ ہے تصویر چشم انفعال

ہر پیشانی ہی چہرہ چاند ہے ابرو ہلال — چرخ والو" سچ کہو دیکھا ہے یہ نور جمال

رشک کیون ہو اپنا اپنا سب کو پیارا چاند ہے

وہ تمہارا چاند ہے اور یہ ہمارا چاند ہے

طعنہ زن شاعر پہ کیون ہے کیون کشش سے شاد ہے — ماہ نو۔ ہان ہمکو استاد ہمایون یاد ہے

تلخ کہنہ ابھی تک خانہ برباد ہے — کچھ بس اک تیرے حسن کی روداد ہے

روز گردون مضطرب ہے اسکے شوق دید سے

کتنے تارے ٹوٹتے ہین پوچھ شام عید سے

ے ہمایون بادشاہ دہلی عید کا چاند دیکھنے کوٹھے پر گیا تھا اور کوٹھے سے گر کر انتقال کیا۔۱۲

نوروز نمبر

ہمنے عید نمبر کو باوجود اپنی مشکلات کے ایک ہی ہفتہ مین پیش کش ناظرین کردیا جو جنوری و فروری کا یکجائی نمبر ہے اور اب اسی کے بعد مارچ مین نوروز نمبر نکالنے کا مصمم ارادہ ہے جو اپنی خصوصیات مین عید نمبر سے کم نہوگا قیمت ۸/

تابش اجتہادی
منیجر نظارہ

بانیانِ عید کی عید

(از مولانا بدرؔ اجتہادی مدظلہٗ)

ریگستانِ عرب کے دوسرے دار الاسلام میں پہلے قصر اللہ کی تعمیر ہوئی پھر خلیفۃ اللہ نے تختِ نبوت پر جلوہ فرما ہو کے خدائی قانون کو قرآن حکیم کی صورت میں پیش کرنا شروع کیا اور حلقہ بگوشان اسلام دفعاتِ محکم پر خندہ پیشانی سے عمل کرنے لگے۔

روزانہ پانچ معمولی دربار ہوتے تھے جن میں ارکینِ اسلام جمع ہو کے ادائے بندگی کرتے تھے۔

ہر آٹھویں دن ایک دربارِ خاص ہوتا تھا جس میں خصوصیت سے تمام عمائدینِ اسلام مجتمع ہو کے پہلے شہنشاہ اسلام کی تحیۂ غیر یہ سنتے تھے پھر زمین بوس ہو ہو کے رخصت ہو جاتے تھے۔

سال میں دو مرتبہ دربارِ عام ہوتا تھا جس میں شہر و مضافاتِ شہر کے تمام اہالیانِ اسلام بڑے تزک و احتشام کیساتھ پہنچتے پہلے اظہارِ عقیدت کرتے تھے پھر ظل اللہ کی رسولانہ تقریر سے مستفید ہوتے اور ایک دوسرے کو باریابی پر تہنیت دیتے ہوئے بغل گیر ہوتے تھے۔

اللہ رے دربارِ عام کا اشتیاق جسکی شرکت کیلئے معمولی دربار دو میں حاضر ہو ہو کے آدابِ دربار محفوظ رکھے جاتے تھے جو جو زمانہ نزدیک ہوتا جاتا تھا، خلوص و اہتمام میں زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب پہلے دربارِ عام کے صرف تیس دن رہ جاتے تو انہماک و اشتیاق کی یہ حالت ہو جاتی کہ دن کا کھانا پینا حرام ہو جاتا ہر وقت تہنیت نامہ کی تکرار اور آدابِ دربار کی یاد آوری سے کام رہتا تھا۔

مدینہ والوں کی نئی نئی تنظیم نے خدائی دربار کا نورانی منظر بار ہا دکھا چکنے کے بعد بھی مسلمانوں کے دلوں کو ایسا پُر خلوص بنا رکھا تھا کہ ہر دوسرے دربار کے بعد سے پہلے دربار کا انتظار ہونے لگتا تھا اور جہاں دربار کا زمانہ قریب آیا مدینہ کے در و دیوار سے مسرت ٹپکنے لگی گھر گھر درباری لباس سلنے لگے۔ ہر مسلمان بڑے انہماک سے شرکتِ دربار کا انتظام کرنے لگا۔

ایک مرتبہ اسی پہلے دربار کی رات تھی، لوائے آسمانی پر نشانِ ہلال نے نمایاں ہو کے صبح کو دربارِ عام منعقد ہونے کی خبر دی تھی بازاروں میں چہل پہل تھی۔ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں خرید و فروخت جاری تھی۔

مدینہ والے شرکتِ دربار کا انتظام کر رہے تھے۔ کتنے ہی پہلے سے سازو سامان کئے بیٹھے تھے، درباری لباس رات ہی سے کھونٹیوں کے الگنیوں پر لٹکا دیئے گئے تھے۔

ہر طرف سے مشک و عنبر کی خوشبو پھیل پھیل کے شہر بھر کو طبلۂ عطار بنائے ہوئے تھی کہ امام حسنؑ و امام حسینؑ داخلِ بیت الشرف ہوئے۔

"کیون اماں! کل عید ہے" حسنینؑ نے بی بی سیدہؑ سے پوچھا۔

"ہاں اماں کی جان! کل عید ہے" سیدہ عالم نے جواب دیا۔

"تو کل عرب کے لڑکے اچھے اچھے کپڑے پہنیں گے اور ہمارے بھی پھٹے پرانے کپڑے ہونگے" حسنینؑ نے آبدیدہ ہوکے کہا۔

"تم بھی پہننا" ماں نے بچوں کا دل رکھنے کیلئے کہلایا۔

"ہمارے کپڑے کہاں ہیں۔ لائیے ہم دیکھیں تو کیسے ہیں"

"تمھارے کپڑے خیاط کے یہاں ہیں۔ جب سی کے آئینگے تو دیکھ لینا"

"ابھی تک تو خیاط آیا نہیں۔ اب نہ معلوم آئے کہ نہ آئے"

"جب کپڑے سی جائینگے تو لیکے آئیگا"

"اگر صبح تک نہ لایا تو ہم اس حالت سے مسجد نہ جائینگے، وہاں ہمجنوں کو دیکھ کے شرم آئے گی"

"تم اسوقت سو رہو خیاط جسوقت بھی کپڑے لایا میں تمکو جگا دوں گی"

حضرت حسنینؑ ماں کے کہنے سے سو رہے اور سیدہ عالم سوچ میں پڑ گئیں کہ صبح کو کپڑے کہاں سے لاؤنگی۔ رات گذرتی جاتی تھی اور بی بی سیدہ کا رنج بڑھتا جاتا تھا۔ نہ تو نیند آتی تھی نہ دل کی الجھن گھٹتی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیدہ عالم نے پوچھا "کون ہے؟"۔

جواب ملا "میں ہوں خیاط حسنینؑ کے کپڑے لایا ہوں"

بی بی سیدہ خوش خوش دروازہ پر گئیں اور ایک دست بقچہ لئے ہوئے واپس آئیں۔ اسے کھول کے دیکھا تو دو سفید عمامے اور دو سفید جامے رکھے ہوئے ہیں۔ کیسے نورانی، کیسے خوبصورت کہ اپنی سادگی میں بھی لاجواب، ساری دنیا میں جہاں ڈالی جائے تو بھی نظیر نہ ملے معصومہ کا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا، اسیوقت بچوں کو جگا کے کپڑے پہنا دئے۔

تھوڑی دیر میں صبح ہوگئی، نماز فجر کے بعد حضرت رسالتمآبؐ تشریف لائے نواسوں کو نئے نئے کپڑے پہنے دیکھ کے خوش ہوگئے۔

"بیٹیا! جانتی ہو یہ کپڑے کہاں سے آئے" حضرت رسالتمآبؐ نے پوچھا۔

"رات کو خیاط دیگیا تھا۔ آپ ہی نے بھیجے ہوں گے" معصومہ نے جواب دیا۔

"پارۂ جگر! وہ خیاط نہ تھا، رضوان جنت تھا، یہ کپڑے جنت کے توشہ خانہ کے ہیں۔ تمھارے خوش ہونے کی بات ہے کہ خدا نے تمکو اتنی عزت دی ہے" باپ نے بیٹی کو خوشخبری دیتے ہوئے فرط انبساط و محبت سے اپنے پیارے نواسوں کو گلے لگالیا۔

یہ تھی خاندان رسالت کی عید جس میں خدا نے بھی حصہ لیا۔ بچوں کی عید تھی کہ لباس جنت پہننے کو ملا۔ ماں کی عید تھی کہ خدا نے بات رکھ لی۔ نانا کی عید تھی کہ حسنینؑ خدا کو بھی عزیز ہیں۔

ماضی کے حالی

(نقابدار سبز کوش کے قلم سے

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص، شمس العلما لقب۔ پانی پت کے عظیم الشان ادیب ہیں جن کے نام سے حالیہ شاعری لرزہ براندام ہے۔ آپ پانی پت میں پیدا ہوئے لاہور میں گھل مل کر رہے حیدرآباد میں زندگی کے قلعات فتح کیے لیکن نہ حیدرآبادی ہوئے نہ لاہوری۔ بلکہ دہلوی کہے جاتے ہیں۔

پانی ۔۔ میں مرے گا جہان پر نشیب ہو

آپ اول و آخر معلم الاطفال تھے شاید اسی بنا پر ملک الشعرا کی جگہ شمس العلما قرار پائے اگرچہ آپکی علمی قابلیت آپکی تصانیف سے ثابت نہیں ہوتی جہاں تک ہمارے مطالعہ کا تعلق ہے ان سب کو حشو و زوائد کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے شمس العلما ہونا اگر بی۔ اے کی ڈگری یا کوئی اور بڑا ڈپلوما ہو تو سر تسلیم خم کرنا لازم ہے لیکن یہ لقب برٹش انڈیا کے قیام میں حاصل نہیں ہو سکا جہاں آپکے قابل معاصر موجود تھے ہمیں کوئی شک نہیں کہ امرائے دکن حکام رس تھے اور ان امرا سے آپکے مراسم دادخواہ ۔

بشریت ہمیشہ خود ستا و خود پسند ہے اسی بنا پر خواجہ صاحب نے اپنے استاد مرزا نوشہ غالب کی ہجو سے ترقی شروع کی غالب کو ان سے سخت رنج پہونچا مگر خواجہ حالی کو سنت اور ننگ زیب پسند تھی گول کنڈے کی ہوا کھینچ رہی تھی جب شاہجہان سے باپ کو قید کر کے عالمگیر کی مولویت کے ابرو پر بل نہ آیا تو خواجہ صاحب کی خواجیت پدر معنوی کی ہجو سے کب جھجک سکتی تھی ۔

چنانچہ اسوقت بھی خواجہ حالی کی جو شہرت چاردانگ ہندستان میں ہے کسی کاتب خوان سے پوشیدہ نہیں ہے اگرچہ آجتک نہ معلوم ہوا کہ خواجہ حالی اور شاعری میں کونسی نسبت ہے ہاں آپ کی فارسیت البتہ مانی ہوئی چیز ہو سکتی ہے اسلئے کہ آپکی ولادت سے بھی پہلے آپکے گھر میں گہری عجمیت نمایاں تھی اور شاید اسی بنا پر آپکے دادا کا نام خدا بخش کی جگہ ایزد بخش ہو کر فکر توارد سے محفوظ کر دیا گیا۔ آپکا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ انصاری تک پہنچتا ہے جو جابر انصاری کے پدر بزرگوار تھے اور جابر انصاری کھلے ہوئے شیعہ ہیں بقول علامہ مجبی شہری کے خواجہ آتش کا جب کنبہ سُنّی تھا تو وہ شیعہ کب ہو سکتے ہیں اسی طرح جابر انصاری کے فرزند کا (خواجہ حالی) سُنّی ہونا الحاق ہے۔

خواجہ حالی شیعہ ضرور تھے مگر افسوس کہ شاعر نہ تھے چنانچہ فی الحال ہمارے سامنے آپکا وہ مرثیہ ہے جو آپنے اپنے استاد

غالب کے منصفانہ عنسم مین فرمایا ہے ۔

بحر ہستی بجز سراب نہین چشمۂ زندگی مین آب نہین

اصول شعر مین یہ مسلم ہی کہ مصرع ثانی وزن و معنی مین مصرع اول سے زیادہ ہوتا ہی اور دوسرا مصرع شرح مصرع اول اگر ایسا نہو تو مصرع اول کے بعد دوسرے مصرع کی ضرورت ہی نہو گی ۔

حالی نے مصرع اول مین ہستی کا لفظ بمعنی کائنات استعمال کیا اور اسکو بحر کے مقابل مضاف بھی کیا جو چشمہ اور نالاب وغیرہ سے وہی نسبت رکھتا ہی جو کل کو اپنے کسی جزء سے ہو سکتی ہی چنانچہ چشمۂ زندگی کائنات کا ایک حقیقت جزء ہی جب مصرع اول مین کائنات کو سراب تسلیم کر لیا گیا تو اب چشمۂ زندگی مین آب کا نہونا تحصیل حاصل ہی ۔

ایک صاحب زادے ایک بڑھیا کے سامنے حوادث سماوی کا رونا روتے روتے کہنے لگے کہ سب سے بڑا داغ جو اس فلک نیلی نے دیا ہی وہ یہ ہی کہ میری کالی بھینس مر گئی یہ سنکر وہ ضعیفہ بھی رونے لگی اور کہنے لگی کہ بیٹا بیشک یہ خانہ عالم رہنے کی جگہ نہین ہی یہان ایسے ہی مصائب کا سامنا رہتا ہی چنانچہ آج میری کالی ہانڈی بھی ٹوٹ گئی ۔ کالی بھینس اور کالی ہانڈی مین وہی نسبت ہے جو حالی کے بحر ہستی اور چشمۂ زندگی مین پائی جاتی ہے ۔

یہ زد بے نہر ہے کہ ہے اسکی صلح مین چاشنی لڑائی کی

علامہ حالی مذمت دنیا فرماتے ہین ۔ بے مہری عالم بے ثباتی دنیا و فریبکاری طلسم وجود وہ عنوان ہین جس پر تقریباً تمام زبانون مین اہل زبان حضرات بہت کچھ کلام پیش کر گئے ہین چنانچہ بدگویان لکھنؤ مین مرزا شوق کی زہر عشق اس موضوع پر نقش حجر ہو چکی ہی خواجہ حالی اس عام موضوع پر اگر شعر مندرجہ بالا فرماتے ہین جو نہ صرف ان کی خیال پست طبعی کا نشان ہی بلکہ بندش کے لحاظ سے بھی عیب ناقبول سے مزین ہے ۔

حالی کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہی اور اب دو گروہ ہین ایک بھونڈے الفاظ ”خلاف محاورہ اصطلاح“ سست بندش سے ان کو نا قابل ذکر جانتا ہی اور دوسرا گروہ ان کی جدت خیال کے سامنے ان کمزوریون کو قابل عفو سمجھتا ہی لیکن اگر جدت خیال اسی کا نام ہی تو حالی کے سوا عالم شعر مین کوئی دوسرا شاعر نہین گذرا - ہمارے خیال مین ان الفاظ اور ان خیال کی بدنصیبی ہوا کرتی تھی جو حالی کے پالے پڑ جاتے تھے ۔

ممکن ہی کہ حالی کے جدت خیال کو آپکے مشہور مسدس سے پیدا کیا گیا ہو لیکن مسدس مین سوا تاریخی مطالعے کے اور کچھ بھی نہین ہی اندلس و عرب و عجم کی اسلامی شاہیون کو مقامی شعرا نے جن دردناک الفاظ و معانی کے ساتھ آج سے صدیون پہلے رویا ہی وہ حالی کے حاشیہ خیال مین بھی کبھی نہ آیا تھا اور جہان سے مسدس مین تاریخ ہی وہین سے جدت ندامت کے قدمون پر سر رکھ دیتی ہی ۔

ان تمام کمزوریون کے بعد یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ لالہ پیارے لال کی انتھک کوششون سے جب خواجہ حالی لاہور کے ایک تعلیمی بک ڈپو مین ملازم ہو گئے تو آپ کو یہان علامہ آزاد کا حلقۂ تقلید گلے مین ڈالنا پڑا علامہ آزاد شیعہ تھے اسلئے خواجہ حالی نے جذب باطن کی وجہ سے آپ کی شاگردی اختیار کی ہوگی لیکن بہرطور آپ ایک مقلد شاگرد سے زیادہ مرتبہ نہ پا سکے اور وہ بھی ایسے شاگرد جو استاد کیلئے باعث عزت و مسرت نہ تھے۔

ہے بہار حظِ وصل سے محروم جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی

حظ کو اگر بمعنی حصہ کہا گیا ہے تو حصہ وصل مین کسقدر بے تکاپن ہے اور اگر عام اصطلاح کی تقلید بیجا کی گئی ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ فلان کو حظ آ رہا ہے تو یہ شعر دائرہ تہذیب سے بھی باہر ہے۔

بات بگڑی رہی سہی افسوس آج خاقانی و سنائی کی

یہ تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ خواجہ حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کی زندگی مین اون کی ہجو کہی تھی اگرچہ بعد کو منکر ہو گئے لیکن اب آپکا حلقۂ تقلید اس مرثیہ کو آپ کی سعادتمندی کا نہ بہانہ بتاتا ہے جس کے بعد ہجوگوئی کا کوئی محل باقی نہین رہتا مسلم الثبوت ہے کہ دو خوبیان عرصے سے پائی جاتی ہین ایک سچائی اور دوسرے پردہ پوشی چنانچہ صدق گوئی اون پرانے مورخین کا دستور العمل تھا جنھون نے گیہون اور کانٹے الگ الگ کر دئے اور پردہ پوشی اب بعض محلی شہریون کے حصہ مین آئی جو عیش و عشرت کے مست "دولت و حکومت کے دیوانے بادشاہون کی سیہ کاریان دھو دھو کر سفید کر رہے ہین ان کے پاس یہ دے کر وہی دلیلین رہ گئین ایک مورخین کو متعصب بنا اور اگر اس پر بھی کام نہ نکلے تو واقعات کو الحاقی کہدینا۔ ہم بھی اس پر راضی ہین اور اگر غارت بغداد و قتل خلیفہ عباسی کا واقعہ الحاقی ہو اور چنگیز ایک مرد رحیم القلب ثابت ہو جائے تو ہمارا کیا نقصان ہوتا ہے اسی دلیل سے ہجوگوئی کا واقعہ الحاقی سمجھنا چاہیئے۔

لیکن افسوس ہے کہ حالی نے مرثیہ مین بھی ہجو کرنے کا قصد کر لیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بہترین طریقہ سے اس کام کو پورا کیا مرنے کے بعد مرنیوالے مین جو خوبیان نہ بھی ہون وہ بھی وارد کر دیجاتی ہین چنانچہ ہندوستانی اولیاء کے کرامات اسی خوش عقیدگی کے مرہون منت ہین پھر نثر کی جگہ نظم مین تو مبالغہ کی حد نہین رہتی اور سچ بھی یہی ہے کہ شعر وہی ہے جسمین مبالغہ ہو۔

لیکن خواجہ حالی اپنے استاد کو نہ فردوسی وقت کہتے ہین نہ فخر روم و نظامی بتاتے ہین بلکہ خاقانی و سنائی کی رہی سہی بات فرماتے ہین اس خوش اسلوبی سے ہجو کہا جسکو لوگ مدح سمجھین حالی ہی کا حصہ ہے۔

بلبل ہند مر گیا افسوس جسکی تھی بات بات مین اک بات

یہ شعر ہجو کی تکمیل ہے اسلئے کہ علامہ حالی کے تجربے سے یہ بعید ہے کہ آپ بلبل ہند کے لقب سے نا شناسا ہون۔

دل مین چبھتا ہے۔ وہ اگر بمثل دن کو کہتا دن اور رات کو رات

اوستاد کی شاعری کی سب سے بڑی مدح یہ ہی کہ وہ دن کو دن اور رات کو رات بھی کہتا تو دلمین چبھ جاتا چونکہ خواجہ حالی نصرف الفاظ سے تعلق نہ واقف تھے اسلئے اون سے یہ شکایت بیجا ہی کہ اونھون نے چبھ جانے کی جگہ کھپ جانا کیون نہ کہا۔

دوسرے وہ خفیہ ہجوگوئی کے ولولے مین خود فراموش تھے۔ شاعری کی بدترین قسم یہ ہے۔

دندان تو جملہ در دہانند چشمان تو زیر ابروانند

حالی نے کس سلیقہ سے بتایا ہی کہ غالب تحصیل حاصل کہا کرتے تھے کیونکہ امتیاز روز و شب مدتون پہلے ہوچکا ہی۔ ممکن ہی کہ ناظرین کرام کی توجہ حرف شرط (اگر) کی طرف منعطف ہو لیکن بہرطور وجود مابہ' غالب مین ماننا ہی پڑے گا۔

ہوگیب نقش دلپہ جو لکھا قلم اوس کا تھا اور اوسکی دوات

اس شعر مین ...... بیٹھے سے بیگار بھلی کا خوبصورت ترجمہ کیا گیا ہے میرے خیال مین اوستاد تو اوستاد کسی اجنبی کو بھی اسطرح بر نہین کہا جاسکتا۔ اور اگر یہ ذوماننہ در کیک جملہ مقصود نہین ہی تو دونون مصرعون کا ربط نیاز صاحب کے باب الاستفسار مین ڈھونڈھنا چاہیئے۔

خدا کرے یہ دو لخت نہون

افسوس کہ اس بیگار کا یہی حل اس شعر سے نہوسکا ورنہ اس سستی سمو مین کسی نہ کسی قیمت پہ کام آجاتا ہی۔

تھین جو دلی مین اوسکی باتین تھین لیکے جائین وطن کو کیا سوغات

اسکے مرنے سے مرگئی دلی خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

شعر خاص مین تصرف نہ جائز ہی نہ کسی کو اس کا حق ہو سکتا ہے۔ مگر خواجہ حالی نے مرزا نوشہ کو خواجہ نوشہ کردیا اسکا کھلا ہوا سبب یہ ہی کہ مرزا کا الف تقطیع سے گرجاتا خواجہ حالی نے شعر کو عیب سے بچا لیا اور غالب کے نسب مین عیب پیدا کردیا اس سے بڑی اور کوئی ہجو ہوسکتی ہی اس سے بہتر تھا کہ مصرع یون کہا جاتا " نوشہ مرزا تھا اور شہر برات " اور لفظ کے لغوی معنی لئے جائین تو اور مہمل ہی۔ پھر تحقیق کیلئے عجیب و غریب عنوان بحث بھی پیدا فرمادیا یعنی غالب اس لئے شیعہ سے سنی بنائے گئے کہ لوہارو کے سنی المذہب اپنے اونکو دفن کیا تھا مثل مشہور ہی مرغ بدست زن۔ اگر کسی ہندو ریاست مین یہ واقعہ ہوتا تو شاید غالب ہندو ہوجاتے۔

اب کیا وجہ ہے کہ غالب مرزا سے خواجہ نہو جائین جبکہ اون کے مسلم الثبوت شاگرد اون کو خواجہ کہہ رہے ہین مزید ثبوت پر بھی ہین کہا جاتا ہے کہ دہلی مین تین سو سے زیادہ خاجاؤن کی پالکیان آتی تھین اور غالب کا قیام بھی دہلی مین تھا دوسرے ان کی قبر بھی خواجہ خواجگان حضرت نظام الدین اولیا کے پڑوس مین ہی علامہ مچھلی شہری نے خواجہ آتش کو سنی بنانے مین یہ دلیل پیش کی ہی کہ اون کے بعض دوست سنی تھے لہذا خواجہ آتش بھی سنی تھے یونہی مرزا غالب خواجہ غالب تھے اسلئے کہ خاجاؤن سے جیتا دمیتا اون کا تقرب ثابت ہے۔

ان دونون شعرون مین نکات ادبی اور بھی ہین خواجہ نوشہ (دولھا) دہلی برات" سوغات اسی نظر سے جہیز اب ہا وطن حالی اوسکو میکہ کہہ لیجیے اس بنا پر کہ خواجہ حالی کا وطن غالب کا میکہ ہی جب بھی خواجیت ثابت امید کہ نیاز صاحب باب الاستفسار مین سعی فرمائینگے۔

غرض یہ پورا مرثیہ حالی نے اسی رنگ مین کہا ہی اور آخر مین تصنع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور فرما دیا کہ مجھے غم والم بھی جیسا چاہیے ویسا نہین ہے۔

کس طرح آسمان پہ پہنچاؤن | پست مضمون ہے نوحہ اوستاد

ناوک پڑا جگر پہ نکلا دھوان دہن سے

(از "عبل ہند" حضرت "ذاخر لکھنوی")

آیا تو دل کی جانب ناوک کسی کا سن سے | چلہ کمان کا ٹوٹا ظالم کے بانکپن سے
وسعت لحد کی مجھپر پہلے سے منکشف تھی | نکلے نہ پاؤن میرے باہر حد کفن سے
غربت زدون کے نالے کچھ فائدہ بھی دینگے | اے موت فاصلہ ہے کتنا مرے وطن سے
انجام شب کی حالت مین تو نہ کہہ سکونگا | آثار صبح پوچھو ہر شمع انجمن سے
جوشش آب آئینہ مین اور آیا وقت زینت | بڑھتا رہا تلاطم زلفون کی ہر شکن سے
جو روح بوستان تہین دامن مین ہین وہ کلیان | ساری بہار لیکر نکلا کوئی چمن سے
سینے مین جو نہان تھی وہ آگ تمنے چھیڑی | ناوک پڑا جگر پہ نکلا دھوان دہن سے

میرے لہو کی پرسش ہوتی ہے روز محشر
ہان ہان وہ کہہ رہی ہین مجمع مین بھولے پن سے

آدب کے پنچ
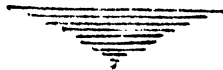
ہماری عید

(از جناب سید بہادر صاحب بزم لکھنوی)

اے ہلال عید تو ہے مرہم زخم جگر
درد دل مین کچھ کمی ہو تو جو آجائے نظر

لوگ میدانون مین آئے ہین گھرون کو چھوڑ کر
تیرے استقبال کو بیٹھے ہوئے ہین گھانس پر

منتظر تیرا ہر اک بیمار غم بستر پہ ہے
تیری خاطر اک ہجوم عام گھنٹہ گھر پہ ہے

عید کے دن ہین عجب انداز کی تیاریان
میہمانون کی گھرون پر آ رہی ہین ڈولیان

بعد مدت کے ملین بچھڑی ہوئی ہمجولیان
ہین گردن مین ڈہی ہین خوش ہین گھر کی لڑکیان

ایک جانب اس خوشی کا تذکرہ بوڑھون مین ہے
ایک جانب غل مبارکباد کا بچون مین ہے

ذکر کیا بچون کا ہان بوڑھون کی دیکھو آب و تاب
بعد کنگھی کے لگایا اپنی ڈاڑھی مین خضاب

جب دیا مونچھون پہ بل چہرے پہ آیا رعب و داب
اور ملکر عطر کو پوشاک پہنی لاجواب

قصد چلنے کا کیا لڑکے یہ بولے ٹھہریے
آپ جاتے ہین کہان عیدی تو ہمکو دیجیے

ہر حسینان چمن مین ہر طرف ذکر بہار
عید کے دن خوش ہین سب کوئی نہین ہے دلفگار

ایک جانب ہو رہا ہے اپنی عیدی کا شمار
چھوٹے بھائی کا بڑے بھائی سے کہنا بار بار

تم بڑے تھے اسلئے تمکو اٹھنی مل گئی
ہم نھنے چھوٹے اسلئے ہمکو چونی مل گئی

نوجوانون کا ذرا دیکھے تو کوئی بانکپن ؛ ہے خوشی دامن سے لپٹی دور ہین رنج و محن

جگمگاتے ہیں باغ میں کرتے ہیں سب سیرِ چمن　　خوش ہیں پردیسی دلوں سے دور ہے یادِ وطن

ہیں نئی پوشاک سب نازک بدن پہنے ہوئے

قبر میں مردے بھی ہیں اُجلے کفن پہنے ہوئے

ذکر کیا غربت کا ہو مفلس بھی اب مسرور ہیں　　آج کا دن وہ ہے سب رنج و الم کافور ہیں

دل میں جو تھیں کلفتیں وہ عید کے دن دور ہیں　　اہلِ دولت خوش ہیں اور دلشاد سب مزدور ہیں

ہر محلے میں نمازِ عید کی کتنی ہے دھوم

مسجدوں میں چل کے دیکھو اہلِ ایماں کا ہجوم

یوں تو کہنے کو کہو کہہ دوں ہر اک دلشاد ہے　　ہاں مگر اک میں ہوں جس کی زندگی برباد ہے

باغِ دنیا میں جسے دیکھو وہی آزاد ہے　　اہلِ جور و ستم لیکن میرا صیاد ہے

جھک گئی گردن مری رنج و الم کے بار سے

مجھکو کیا مطلب بھلا اس عید کے تہوار سے

عید آئی ہے بالکل نئے انداز سے　　مجھکو کیا مطلب بھلا دنیا کے سوز و ساز سے

کان میرے آشنا ہیں درد کی آواز سے　　ہوں شکستہ پر مجھے مطلب نہیں پرواز سے

کیا غضب ہے میں خوشی کے واسطے ترسا کروں

لوگ تو کھائیں سویاں اور میں منہ دیکھا کروں

کیا کروں شکوہ کسی کا خود میں اس قابل نہیں　　میں تو وہ مقتول ہوں جس کا کوئی قاتل نہیں

ہے بھنور میں میری کشتی دور تک ساحل نہیں　　میرے دل میں جو ہے پوشیدہ وہ دردِ دل نہیں

جس سے میں رونے لگوں ایسی ہنسی اچھی نہیں

اے فلک یہ روز کی تو دل لگی اچھی نہیں

ہمکو خواہش موت کی ہے زندگانی کیا کریں　　ہمکو پیری چاہیئے ہے نوجوانی کیا کریں

تجھ سے شکوہ ہم بھلا اے دارِ فانی کیا کریں　　بند جو پنجرے میں ہوں وہ حکمرانی کیا کریں

منہ سے اُف نکلے نہ یہ صیاد کی تاکید ہے

کس طرح اے بزمِ ہم کہہ دیں ہماری عید ہے

عید کی دیوی

(از جناب محمد سردار حسین صاحب بہزاد لکھنوی)

(اپنے نظارہ کے لئے)
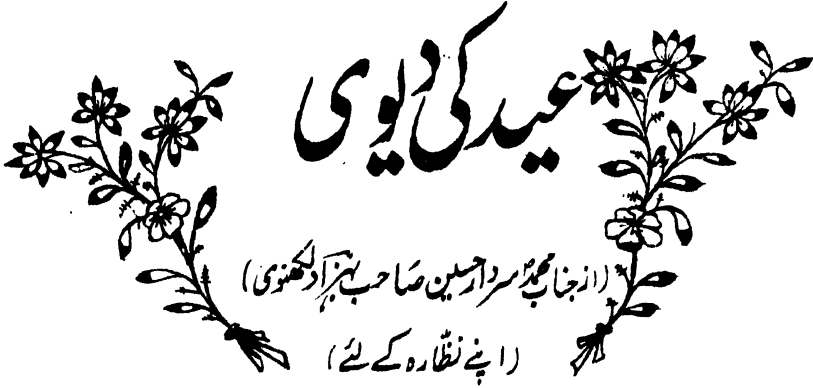
جمیل نے بیتابانہ مڑے ہوئے کاغذ کو کھولا اور حسب ذیل عبارت پڑھی۔

ہردے کے سنگھاسن پر براجمان کرنیوالے میتم خوش رہو۔ تمھارا پہلا پریم پتر ملا جس کا ایک ایک شبد میرے ہردے کے کنول کھلا رہا ہے۔ پریم پیارے گو مین ایک ہندو دھرم کی استری ہون لیکن پریم مین دھرم کوئی چیز نہین۔ تم چندرمان ہو مین چکور۔ تمھاری آگیا کا پالن میرا دھرم ہے۔ تمھاری سندرتا نے میرا دل ہی نہین مول لیا بلکہ مجھے تمھارا داسی بنا دیا۔ برہا کی اگنی مرے تن من کو پھونک رہی ہے اور بری طرح۔ میرے شریر کا رونگٹا رونگٹا تمھارے پریم کی دھن مین جھوم رہا ہے میرا دل یہ چاہتا ہے کہ تمھارے چرنون پر اپنا سیس جھکا دون اور اپنی زبان سے کہہ دون کہ مین تمھاری داسی ہون۔

تمھاری پریم کرنے والی

اندری

جمیل کا چہرہ مختلف الوان کا آماج گاہ تھا۔ وہ تمام جسم سے کانپ رہا تھا۔ شباب کے پرامنگ زمانے مین اسکو یہ پہلا خط ملا تھا۔ وہ خود بیکاپور کے تعلقدار کا اکلوتا فرزند تھا۔ اسکی تعلیمی حالت ضرور ناقص تھی لیکن اچھی صحبت نے اسکی کم تعلیمی کو چھپا لیا تھا۔ اس کا باپ پرانے خیالات کا آدمی تھا اسلئے اسکے باپ کو بھی اسکی تعلیم کی طرف کوئی خاص لگاؤ نہ تھا جمیل ایک حسین نوجوان تھا۔ بیکاپور ہی کے قرب مین ایک دوسرا تعلقہ بھی تھا جو ٹھاکر گیان سنگھ کی ملک تھا۔ ٹھاکر صاحب بڑے متعصب ہندو تھے۔ ان کی اکلوتی لڑکی اندری کی ملاقات بالکل اتفاقیہ جمیل سے ہو گئی۔ اور یہانتک سلسلہ بڑھا کہ خط وکتابت کی نوبت بھی پہونچ گئی۔

یہ اندری کا پہلا خط بطور جواب کے تھا۔

جمیل نے خط کئی بار پڑھا اور اسکو اپنی جیب مین رکھ لیا۔ اب وہ اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ رستہ مین اسے چند راہ گیر آتے ہوئے ملے جمیل سے ایک مخاطب ہوا۔ "کہو بھیّا ٹھاکر صاحب کا کونسا گاؤن آئے"۔ (ٹھاکر صاحب کا کون گاؤن ہے) سعید نے انگلی سے داہنی جانب اشارہ کر دیا۔

اسی طرف (طرف) چلے جاؤ۔

ان راہ گیرون مین ایک بدقوارہ انسان بھی تھا جو بہ لحاظ پوشش ان کا رئیس معلوم ہوتا تھا۔

اُسنے جمیل سے پوچھا۔

"میان جی اک بات پوچھی بتیہیو (اک بات پوچھون بتاؤگے)

"پوچھو"

بھلا ٹھاکر صاحب کی کونو بِٹری ہے (کیا ٹھاکر صاحب کی کوئی لڑکی ہے)

"ہان سنت توہن (ہان سنتا تو ہون)

کا بڑی سندر ہے (کیا بڑی خوبصورت ہی)

"دیکھا ناہین مداسنت ہین (دیکھا نہین لیکن سنتا ہون)

"تم برا نا مانیو بات یہ آے کہ ہم اپنے بیاہ کیلئے بات کرے جائے رہے ہین ہم بلاس پور کے ٹھاکر آن سمجھیو۔(بات یہ ہی کہ ہم اپنے بیاہ کیلیے بات کرنے جارہی ہین ہم بلاس پور کے ٹھاکر ہین سمجھے)

جمیل نے سر سے پاؤن تک اسکو ایک نظر دیکھا۔ بلاس پور دوسرے ضلع مین ایک تعلقہ تھا جمیل کو اتنا علم ضرور تھا۔

جمیل اسنے اتنی گفتگو کرتے کے بعد اپنے مکان چلا آیا۔

لیکن اب اس کا دل و دماغ اس مسرت کو کھو چکا تھا جو خط سے پیدا ہوئی تھی خواہ مخواہ اسپر افسردگی طاری تھی وہ چاہتا تھا کہ اندر کی اسکول جائے اور وہ اسکی پوجا کرے "اے محبت"

یکایک اسکی والدہ نے آسے آواز دے کر بلایا۔ دسترخوان بچھا ہوا تھا اور اسکے والد اسکے منتظر تھے۔

بڑی دیر لگائی۔ انھون نے پوچھا۔

جی ہان ذرا باغ چلا گیا تھا۔

بٹیا ایک بات پوچھون بتاؤگے اسکی والدہ نے پوچھا۔

ارشاد۔

"بٹیا آخر تم شادی سے انکار کیون کرتے ہو"

"اسکی صرف وجہ یہی ہی کہ مجھ مین کوئی ذاتی قابلیت نہین اور مین باپ دادا کی پیدا کردہ جائداد کو محض ناکافی تصور کرتا ہون"

"تو اسکے معنی یہ ہین۔ اسکے والد نے کہا کہ تم تمام عمر کنوارے ہی بیٹھے رہوگے کیونکہ تم اب دوبارہ تعلیم حاصل نہین کر سکتے۔

"جو کچھ بھی ہو مین پرائی لڑکی لاکر اسکی زندگی خراب نہین کرنا چاہتا۔

یا یون کہو اسکے والد نے کہا کہ مین ایک ہندنی کے مقابلہ مین ایک مسلمان عورت کو قبول نہین کر سکتا -

جمیل سہم ہوگیا -

جی ہان - اسکے والد پھر دھمکا رہے - گنگا رین ٹیلی سے آپکے عشق کے کل واقعات معلوم ہو چکے ہین - روزانہ باغ مین نظارہ ٹھنڈی سانس خط وکتابت وغیرہ وغیرہ - میان جی حسب نزاد ہے ابھی تک ہمارے خون مین کوئی دوسرا خون شامل نہین ہوا ہی - خدا جانے اب قسمت مین کیا لکھا ہی ؟

یہ کہکر انھون نے ایک ٹھنڈی سانس بھری -

جمیل زنان خانے سے غشکر خاموش باہر چلا آیا اسکے چہرے سے دلی ہیجان آشکار تھے - یکا یک وہ کچھ سوچکر اچھل پڑا -

رات ہونے ہی آہستہ اپنا مختصر سامان باندھا اور شب کی گاڑی سے .... کو روانہ ہوگیا -

صبح کو اسکے سرہانے سے ایک خط اسکے والد کے نام نکلا - ابا جان تسلیم - شب کی گفتگو کے بعد یہ ظاہر تھا کہ میرا اب آپکے یہان قیام محض بےغیرتی پر مبنی تھا میرے آپکے خیالات مین زمین آسمان کا فرق ہی - مین سمجھتا ہون کہ محبت مین ذات پات کا خیال محض فضول ہے -

دوسرے اندری بھی ذات کی بری نہین وہ ٹھکرائن ہی - بہر طور بہتر یہی تھا کہ مین جدا ہو جاؤن - لہذا مین جاتا ہون - میری تلاش نہ کیجیے گا - مجھے صرف والدہ کا خیال ہی ان کو تسلی دیجیے گا -

خادم

"جمیل"

اس خط کے پڑھتے ہی گھر مین رونا پیٹنا پڑ گیا - خود اسکے والد بھی رو رہے تھے اور اپنے کو نفرین کر رہے تھے کہ مین نے کیون ایک جوان بیٹے کے ساتھ سختی روا رکھی -

اسی دن ایک دوسرا خط اندری کو ماتا دین کہار کے ذریعہ سے ملا جو حسب ذیل تھا -

کوملی ہردے والی اندری - تمھارا پریمی سیوک اب تم سے جدا ہو رہا ہی اور کارن یہ ہی کہ پتا جی کو سب خبر لگ گئی ہی اور وہ سختی برت رہے ہین - یہ یاد رکھو کہ ہم دونون ایک بار ملین گے - خواہ اس جنم مین یا اوس - بہر طور میری ہردے کی سونی مندر کی دیوی صرف تمھین ہو جسوقت تمھارا خیال آتا ہی مین جھوم جاتا ہون - پیاری تم میری ہو اور مین تمھارا - دھیرج دھرنا اور کوئی ایسی بات نہ کرنا جسے لاج ٹوٹے - مین ایک بار تمھین پھر دھنیہ باد دیتا ہون -

تمھارا سیوک

"جمیل"

اس خط کے پڑھنے کے بعد جو کچھ کیفیت اندری کی ہوئی وہ یہ تھی ۔

جیسے کوئی برسنے والا ابر　　　یہ تھا چشم پر آب کا عالم

٢

جمیل کے پاس روانگی کے وقت ایک ہزار روپیہ تھا یہ اس کا ذاتی تھا جو مرتے وقت اسکی نانی نے اسکو دیدیا تھا ۔
...... پہونچتے پہونچتے اس کا دماغ اپنا پروگرام مرتب کر چکا تھا ۔ اسنے پہونچتے ہی اپنی شیروانی اور پائجامہ اتار کر ایک ہیجڑے کی نذر کر دیا اور خود ایک دھوتی اور کرتے مین ملبوس ہو گیا ۔

.... ایک ریاست کا پایہ تخت تھا ۔ اس لحاظ سے کافی وسیع اور بارونق تھا اب جمیل نہین بلکہ ٹھاکر دھرم سنگھ تھا جمیل کے نانا ایک حاذق حکیم تھے ان کے مجربات کی بیاض اسکے پاس محفوظ تھی اسنے ایک مکان سرراہ کرایہ پر لیلیا اور سائن بورڈ لگا دیا جس پر جلی حرفون مین حکیم ٹھاکر دھرم سنگھ تحریر تھا ۔ اسکی اس بیاض مین امراض مخصوصہ کے تمام نسخے موجود تھے ۔ اسنے ایک ہزار کی رقم سے جمیل نے تمام ادویہ تیار کین اور ایک کمپونڈر ملازم رکھ لیا ۔ اس نے دل کھول اشتہار بازی شروع کر دی ۔ اس کا کام مقامی طور پر [illegible] ہونے لگا ۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ریاست کا وقوع ترائی مین تھا ۔ اور ان امراض کا منبع ترائی ہوتا ہے ۔ اسکی ادویہ گو اشتہاری تھین لیکن لغو اور مہمل نہ تھین ۔ ایک ہی سال کے عرصہ مین وہ تمام ریاست مین ہردلعزیز ہو گیا اور اسکے پاس کافی سرمایہ بھی ہو گیا ۔ اس اثنا مین اسکے والد نے مختلف اخبارات مین اشتہار دئے کہ جمیل جلد آئے لیکن بے سود ۔

جمیل کے دل مین اندری کی یاد بالکل پہلے ہی کی طرح تازہ تھی ۔ ادھر اندری کے والد ٹھاکر صاحب نے اندری کی شادی زبردستی بلاس پور والے ٹھاکر صاحب کے ساتھ کر دی اسکی وہی مثل تھی ۔

زاغ کی چونچ مین انگور خدا کی قدرت

اندری کے شوہر کا نام دھرمپال سنگھ تھا اور وہ انتہائی بدمزاج آوارہ انسان تھا ۔ اس مین تمام وہ امراض موجود تھے جو ایک بدچلن مین ہوتے ہین ۔ اندری کی شادی کو بمشکل چھ ماہ گذرے تھے لیکن اندری کوفت کے مارے گھل رہی تھی ۔ اس کا دل ابھی جمیل کیلئے بیچین تھا دھرمپال اپنے امراض سے بیحد پریشان تھا ۔ شدہ شدہ اسکے کانون مین ٹھاکر دھرم سنگھ کی شہرت پہونچی اور وہ معہ اندری کے ... آ دھمکا ۔
پہلی ہی نظر مین جمیل اسے پہچان گیا ۔ اور دریافت حال سے اسے معلوم ہو گیا کہ اندری بھی اسکے ہمراہ ہے ۔ علاج شروع ہوا لیکن سوائے ناکامی کے اور کیا تھا مرض اپنی پوری قوت صرف کر چکا تھا اور علاج کے چند ماہ بعد دھرمپال کا خاتمہ ہو گیا ۔

۳

علاج کے دوران میں جمیل برابر اسکے گھر جایا کرتا تھا۔ اندری بھی اسے پہچان چکی تھی۔ ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ دھرم پال کی موت کے بعد ماہ صیام کا زمانہ آگیا یہ کریا کرم کے واسطے اندری اور اسکے والد کو ٹھہرنا ہی پڑا۔ ٹھاکر صاحب اب اپنے کئے پر پچھتا رہے تھے ان کو بڑا افسوس تھا کہ انھوں نے محض دولت کی خاطر جان بوجھکر اندری کی زندگی خراب کر دی۔ کیونکہ عقد بیوگان ہندوؤں میں نہیں ہوتا۔ اندری کی مرضی سے جمیل نے کل واقعہ ٹھاکر گیان سنگھ سے بیان کیا۔ وہ حیرت سے سنتا رہا آخر کار اُسنے کہا بیٹا جمیل وہی ہے تم پریم دیتا ہو۔ مجھے کوئی عذر نہیں اندری تمہاری ہے۔ تم اس سے شادی کر سکتے ہو۔ رہا ہندو مسلمان کا سوال تو دراصل اندری مسلمان ہی ہے۔ اسکا واقعہ یوں ہے کہ ہمیں ہمیشہ سے لاولد ہوں۔ میری سسرال کے قریب ایک غریب خان صاحب رہتے تھے۔ ان کے گھر کبھی کا انتقال یکا یک طاعون میں ہو گیا صرف یہ لڑکی باقی بچی جسکو میری بیوی نے پال لیا تھا۔ یہ میرا کمینہ پن تھا کہ میں نے اس سے اصلی راز اب تک پوشیدہ رکھا۔

اب جمیل کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ماہ صیام گذر گئے اور دن عید آگیا جس کا ہر چھوٹا بڑا طالب ہوتا ہے۔ یعنی یوم عید جمیل کو اس دن کی بڑی خوشی تھی کیونکہ [illegible] یہ دن بڑی خوشی کا ہوا [illegible] اس دن اسکو اندری ملنے والی تھی چنانچہ شب عید میں اندری کا اب نام سیمہ رکھا گیا اور وہ جمیل کے عقد نکاح میں آگئی۔

۴

دوسرے دن جمیل معہ اندری کے اپنے گھر روانہ ہوا۔ اسکے والد اور والدہ کی خوشی کا وہی اندازہ کر سکتا ہے جس نے ایک عرصہ کے بعد اپنے خون کو دیکھا ہو۔ خان صاحب کو اب کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ خون میں خون مل چکا تھا۔

جمیل اندری کو عید کی دیوی کہتا تھا۔

آغاز وہی آغاز اچھا جس کا کہ نہ ہو انجام برا
اس دنیا کی تکلیف اچھی اس دنیا کا آرام برا

تلاشِ جاناں

(ازجناب مولانا حسرت اجتہادی)

مسافرت میں بہت یونہی دم الجھتا تھا　　نہ ہم خیال تھا کوئی نہ کوئی دوست اپنا
کہ ایک روز فضا پر کچھ آئی اُٹھ کے گھٹا　　[illegible]

اُبھر اُبھر کے مرے دل میں پھر گئی صورت ہر بار
کسی کی دلربا یہ چھب ... گئی

نکل کے گھر سے ٹہلتا ہوا چلا سوئے باغ　　دماغ میں وہی فکریں ملا نہ جن سے فراغ
کہ پاؤں گا تو کہیں اپنی بے وفا کا سراغ　　قریب باغ جو پہنچا تو دل کے بڑھ گئے داغ

ہوا چمن کے گلوں میں بسی ہوئی آئی
کسی کی زلف معطر کی یاد دلوائی

کہا تڑپ کے صبا سے کدھر سے آتی ہے　　کسی کی یاد تری ہر لپٹ دلاتی ہے
ہے کوئی بات جو بھید وہ نہیں سماتی ہے　　یہ بھینی بھینی سی خوشبو تری بتاتی ہے

گذر ہوا ہے ضرور آج کوئے جاناں سے
جو آرہی ہے مہک تیرے جسم پنہاں سے

ہماری بات پہ جب ملتفت ہوئی نہ صبا　　تو اضطراب میں گلشن کی سمت پاؤں بڑھا
گمان ہوا، جو روش پر پڑا قدم پہلا　　کہ یہ تو کوچۂ جاناں کا ایسا ہے نقشا

نگاہ شوق سے ڈھونڈا سبھی طرف اُن کو
مگر یہاں تو نہ پایا کسی طرف اُن کو

بڑھا کچھ اور یہاں سے تو آگیا گلشن　　دکھائی دینے لگے مجھکو کمتان حسین

اٹھا رہا ہے ہر اک پھول کا یہ الھڑ پن — کہ ہے شباب کے نزدیک باغ کا جوبن

نگاہ بد سے جہان کی اسے بچانا ہے
اسی سے باغ پہ نیلے فلک کا سایا ہے

شجر لدے ہوے پھولون سے جس طرح ہو دلھن — گلون سے اودے ہین تختے کہین سفید چمن
کہین پہ زرد، گلابی کہین یہ ہے گلشن — ملے جلے ہوے پھولون کی ہے عجیب پھبن

چمن مین جتنے ہین گل اُتنے میرے دل مین داغ
کھلے ہوے ہین برابر کے دو طرف دو باغ

سفید پھولون مین رنگت ہے اُن کے چہرہ کی — گلاب مین وہی رخسار کی سی ہے سرخی
ہیں زرد پھولون کی رنگت تو کرتے کی ایسی — اور اودے پھولون کی سی باندھتی ہین وہ ساری

یہ روپ آج سے پہلے کبھی نہین دیکھا
گذر ہوا ہے ضرور آج باغ مین اُن کا

جو میرے آنے سے پہلے کھڑی ہوئی تھین یہان — تو مجھ کو دیکھ کے پھولون مین ہو گئین پنہان
بھلا کہین میری نظرون سے رہ سکین گی نہان — مین ڈھونڈ لونگا انھین مجھ سے وہ چھپین گی کہان

نگاہ شوق سے کبتک چھپین گی گلشن مین
جو گل مین ہونگی تو آجائینگی وہ دامن مین

یہ سوچتے ہی گلستان کا چھانا کل سبزا — ہٹا کے دیکھا درختون کا ایک ایک پتا
ہر اک گل مین شگوفہ مین غنچہ مین ڈھونڈا — ستم ظریف کا لیکن کہین چلا نہ پتا

تمام پھولون کو چھانا تمام کلیون کو
سوائے زیرہ کے کچھ بھی نہ دیکھا مین نے تو

اسی تلاش مین جب دن گذر گیا سارا — بٹھا دیا مجھے غم نے زمین مین تھا جس جا
چمن نے رات مین بدلا لباس اور اپنا — کسی جگہ پہ اندھیرا کہین اُجالا تھا

نکل رہا تھا درختون کے اُسطرف سے چاند
کہ جس کے نور سے تجلی کی روشنی تھی ماند

جو پتیوں میں سے چھن چھن کے چاندنی آئی یقین ہو گیا اُس جا چھپی ہوئی ہیں وہی
میں خود تو جا نہ سکا دل میں اتنی تاب نہ تھی کہا وہیں سے، تمھیں ہے خبر کسی کی بھی؟

تمام کر دیا چھپ چھپ کے تم نے دن سارا
چلی بھی آؤ تم ہی جیتیں اور میں ہارا

اکیلا باغ ہے دیکھو کہیں نہ ڈر جاؤ میں اپنے دل سے لگا لوں یہاں چلی آؤ
تمام دن تمھیں ڈھونڈا ہے کچھ ترس کھاؤ خفا ہو کاہے پہ آخر مجھے تو بتلاؤ

خطا ہو یا نہ ہو لیکن قبول ہے مجھکو
تم اپنے ہاتھ سے آکے مجھے سزا دے لو

ابھی تو ختم ہوئی بھی نہ تھی مری تقریر کہ پھنگیوں پہ درختوں کی چمکا ماہ منیر
تمام باغ میں پھیلی جو ایک سان تنویر خیال ہو گیا باطل، پلٹ گئی تقدیر

وفور غم میں کیا رخ دیار جاناں کا
اک آہ دل سے کی اور بے قرار ہو کے کہا

کچھ اپنے چاہنے والے کی بھی خبر ہے تمھیں کھلی ہوئی ہیں بڑے انتظار میں آنکھیں
فراق میں تمھیں آخر کہاں کہاں ڈھونڈیں خدا کو مان کے آؤ کبھی تصور میں

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست (حافظ)

ایک ہجران نصیب کی عید

(از جناب پرنس احمد علی مرزا صاحب حشمت کاکوری)

واقعی عید کا دن اہلِ عالم کیلئے اک مبارک اور انتہائی مسرت انگیز دن ہوتا ہی چھوٹے بڑے امیر غریب سب ہی خوش خوش نظر آتے ہین۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو آج کے قابل قدر اور فرحت بخش دن سے لطف اندوز نہو۔ یا جس کو اس روز مسعود کی کوئی خوشی نہو اسلئے کہ عید کا دن اپنی مسرتون اور سعادتون کے لحاظ سے کوئی معمولی دن نہین۔ سال بھر کے بعد دنیا والون کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا ہی جسمین ہر طرف مسرت ہی مسرت نظر آتی ہی اس روز کی آمد کا بےچینی سے انتظار کیا جاتا ہی اور حسب حیثیت لوگ طرح طرح کے انتظامات کرکے اپنی زندہ دلی یا زندگی کا ثبوت دیتے ہین۔

سچ پوچھئے تو عید اور عید کی تمام حقیقی مسرتین انھین کیلئے مختص بھی ہین جن کے پہلو مین قرار آشنا دل ہی کیونکہ غم ہو یا خوشی دونون کا مرکز دل ہی ہے اگر دل شگفتہ ہی تو خیر ورنہ ظاہر ہی کہ ایک پژمردہ و افسردہ دل کو عید اور عید کی خوشی سے کیا واسطہ۔

عید اک عالم کیلئے پیغام عیش و عشرت سہی مگر ایک ایسے ہجران نصیب کے لئے جسکی لامتناہی ناکامیون نے اسکی ہر امید ہر آرزو اور ہر تمنا کو یاس سے بدل کر سراپا غم بنا دیا ہو۔ کوئی ایسی قابل وقعت چیز نہین۔

اسکی طبیعت رنج و غم کی اسقدر حیہ لذت کش ہوجاتی ہے کہ صبح عید پر اپنی شام غم کو ترجیح دیدیتا ہے۔ لبقول عرفی

منم کہ یافتہ ام ذوق صحبت غم را　　بصبح عید دہم وعدہ شام ماتم را

عید کا دن ہے دنیا محو عشرت ہے۔ سارا عالم ہنس بول رہا ہی مگر آہ اک ہجران نصیب کنج کمی اپنی تنہائی اور بیکسی پر خاموشی کیسا تھ آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہی۔

مشتاق جمال آنکھون سے رنگ مایوسی ٹپک رہا ہی اسکی غیر معمولی خاموشیان اسکے دلی تاثرات کی مظہر ہین۔

اکبارگی نہ معلوم کس طرح اُسے آج کے دن کا احساس ہوا معانقے اور مصافحے کا خیال آتے ہی اس متجسس نگاہون سے اپنے گرد و پیش دیکھتے ہوئے اک ٹھنڈی اور لمبی سانس لیکر کہا۔

آہ وہ کہان۔ ع۔　آ اے غم محبت تجھکو گلے لگا ئین۔

رنگ برنگی شاعر

مسٹر "چھپے رستم" کے قلم سے

جس طرح شاعری کی بہت سی صنفین ہین اسی طرح شاعرون کی بھی کئی قسمین ہین۔ شاعری تو اپنی صورت شکل و مضمون سے پہچان بھی لیجاتی ہی کہ فلان صنعت کی ہی مگر شاعر کی قسم پہچاننا ذرا مشکل ہوتی ہی کیونکہ انکی صورت شکل و لباس وغیرہ الگ ہوتے ہوے بھی مذاق طبیعت اسوقت تک نہین معلوم ہوتا جبتک اُن کا کلام نہ سنے۔ پھر بھی ایک قسم کا شاعر ایسا رہجاتا ہی جس کا کلام سنکے بھی ابتک اُسکی قسم نہین بتائی جاسکتی۔ یہ شاعر ایک معمہ ہوتا ہی مختلف رنگ کے کلام کا۔ اسی کی بے جوڑ شاعری اورون کیلئے بھی اختلاف آرا کا باعث ہوجاتی ہی۔ اکثر دیکھا گیا ہی کہ ایک شخص فی الواقع شاعر ہی اور اچھا کہتا ہی مگر اس مین ذاتی وجاہت نہین ہوتی تو لوگ اسکی شاعری پر شک کیا کرتے ہین اور ایک شخص درحقیقت شاعر نہین ہوتا مگر اسکی ظاہری شان و شوکت کو دیکھنے والے بغیر کسی ثبوت کے شاعر مان لیتے ہین اور کبھی شبہ نہین کرتے بلکہ جس کی شاعری مشکوک ہوتی ہی اسکے بیان زبردستی کی عقل آرائیان کی جاتی ہین اور بغیر کسی دلیل کے اپنے شک کو ترقی دیجاتی ہی اور جس کی شاعری کا یقین ہوتا ہی اُسکے بیان بھی بغیر کسی ثبوت کے اپنے یقین کو قوت پہنچائی جاتی ہی، اُسپر مباحثے ہوتے ہین، مناظرے کیے جاتے ہین مگر نہ شک یقین سے بدلتا ہی نہ یقین شک سے۔

یہ فیصلہ کن حضرات کی غلطی ہی، اُن کا فرض ہونا چاہیے کہ کسی کی وجاہت سے متاثر ہوے بغیر شک کے بعد یقین اور یقین سے پہلے ثبوت حاصل کرنے کے بعد رائے قائم کرین۔ اسی طرح ہر شخص کو شاعر بننے سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مختلف الاقسام شاعرون مین سے کونسا شاعر بنے۔

پورا شاعر

تمام علوم و فنون سے واقف، زبان کا ماہر دنیا کی ہر ایک چیز سے متاثر ہوکے اپنے جذبات اس خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہی کہ سننے والا بھی اُسی کی طرح متاثر ہو جائے اسکو اپنی بھلائی مدنظر نہین ہوتی بلکہ دوسرون کی اچھائی چاہتا ہی۔ یہ اپنی زینت نہین کرتا اپنے شعر کی زینت نہین کرتا ہی۔ یہ خود اپنی ذات پر فخر نہین کرتا مگر دنیا اسپر فخر کرتی ہی۔ یہ اپنے شعر کی کوئی قیمت نہین چاہتا مگر اتنی کہ اسکے شعر پر عمل کیا جائے۔ یہ نہ کسی کی خوشامد کرتا ہی اور نہ اسے شاعرون کی واہ واہ پسند آتی ہی۔ یہ حکیم ہوتا ہی اور دنیا کی اپنے جذبات سے اصلاح کرتا ہی یہ خود بدحالی مین بسر کرتا ہی اورون کو خوش حال رکھنے کیلئے۔ یہ خود مصیبتین اٹھاتا ہی دوسرون کو راحتین پہنچانے کیلئے۔ خود اسکا

عمل چاہے ایک زمانہ مین رک جائے مگر اسکے شعر کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔

یہ شاعر نہ خود مرتا ہے نہ اس کا شعر۔

آدھا شاعر

علم و فن سے واقف، زبان پر حاوی۔ جو کچھ کہتا ہے بغیر متاثر ہوے۔ اسکے کلام مین زور ہوتا ہے، الفاظ مین روانی ہوتی ہے۔ معانی کا دریا بہاتا ہے مگر سب آورد۔ دوسرون کو وقتی متاثر کرتا ہے صرف اپنے نفع کیلئے۔ یہ واہ واہ کا دلدادہ ہوتا ہے اور کثیر تعریف کو اپنی ترقی کا ذریعہ بناتا ہے۔ اسکو اپنے ہم پلہ کی ترقی تکلیف دیتی ہے۔ یہ میدان مسابقت مین جم کے مقابلہ کرتا ہے۔ اسکی نظر دنیا کی ہر اچھی چیز پر ہوتی ہے اور اسکے حصول کیلئے اپنے کلام مین رنگینیاں پیدا کرتا ہے۔ اسکو اپنی ظاہری زیب و زینت کا بھی خیال رہتا ہے۔ یہ جتنی زحمت اٹھاتا ہے اپنی راحت کیلئے۔ اسے اپنے کلام کی اچھی سے اچھی قیمت درکار ہوتی ہے۔ اسکو اپنی تفریح طبع کے ساتھ دوسرون کی خوشی بھی ملحوظ ہوتی ہے۔ یہ بے لوث کوئی خدمت کرتا ہے تو زبان کی۔ اسکو اپنے شعر کی محبت ہوتی ہے اور اسپر فخر بھی کرتا ہے۔

یہ شاعر خود مرجاتا ہے مگر اسکا شعر زندہ رہتا ہے۔

انوکھا شاعر

علم و فن سے کچھ واقف کچھ ناواقف، تھوڑا بہت پڑھا لکھا۔ جو کچھ کہتا ہے سب بناوٹ۔ الفاظ مین زیادتی و بلندی، معانی مین کمی و پستی، ترکیبون مین غرابت و اجنبیت۔ اپنی تعریف کا خواہان، دوسرون کی تعریف سے پرہیز۔ اپنا کلام سنانے کا عادی اور دون کا کلام سننے سے گریزان۔ مشاعرون کا دلدادہ، اعتراض کرنیکا گرویدہ۔ کم مایہ لوگون کو مرعوب بنانے کا شوقین۔ ترنم سے اپنے کلام مین اثر پیدا کرتا ہے۔ خود تو وقتی فائدہ اٹھالیتا ہے مگر کسی اور کو ذرا فائدہ نہین پہنچاتا۔

یہ شاعر بھی مرجاتا ہے اور اس کا شعر بھی۔

بھولا شاعر

علم و فن سے ناواقف، تھوڑا بہت پڑھا لکھا، موزون طبع۔ جو کچھ کہتا ہے بغیر سمجھے۔ کوئی طرح نکلے برابر کے دو دو مصرع کہہ کے غزل پوری کرلینا فرض۔ کوئی مشاعرہ ہو دعوت نامہ حاصل کرلینا ضروری۔ راستہ چلتے شعر سنانے اور داد چاہنے کا مرض۔ سامعین کی استہزائی تعریف پر خوش ہونے اور جھک جھک کے تسلیمین کرنے کو حاصل محنت سمجھتا ہے اور بس۔ یہ نہ فائدہ اٹھاتا ہے نہ فائدہ پہنچاتا ہے۔

ہے شاعر خود زندہ رہتا ہے اور اس کا شعر مرجاتا ہے۔

مفت کا شاعر

نہ فن سے واقفیت نہ موزونِ طبع۔ صرف پڑھا لکھا اور خوش آواز۔ اوروں سے کہلواتا ہے اور خود کہنے والوں سے داد چاہتا ہے۔ سخن ور تو نہیں ہوتا مگر سخن فہم ضرور ہوتا ہے۔ اچھا شعر کہہ کے نہ دیا جائے تو ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اسے کہلوا کے پڑھنے کی ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ شعر نہ ملیں تو دوسروں کے کلام پر تصرف کر لینے میں بھی باک نہیں۔ بجنسہٖ بھی اور کچھ تغیر دیکے بھی! اسے کسی کا شعر اچھا معلوم ہو جائے تو وہ بلا تکلف اپنا بنا لے گا۔

ایسے ہی کسی شاعر نے کہیں غزل پڑھی جسکا مطلع تھا ؎

مرا سینہ ہے مغرب آفتابِ داغِ ہجران کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریبان کا۔

کسی نے پکار کے کہا "مطلع ناسخ کا ہے، دیوان میں یوں چھپا ہوا ہے ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجران کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریبان کا"

شاعر نے جواب دیا "آپ کو مشرق و مغرب کا فرق نہیں سجھائی دیتا ؟"

مشاعرہ میں اس حاضر جوابی پر قہقہہ پڑا اور مطلع "ناسخ" سے سارق کا ہو گیا۔

ایسے شاعر کا کہیں ٹھکانا ہے نہ ایسے شعر کا۔

میکش کی عید

(از جناب ابو الخیال میکش لکھنوی)

تمہیں خفا ہو تو غیروں سے کیا شکایت پھر — یہ روزِ عید کا روزِ سعید کیونکر ہو
گلے ملو جو نہ میکش سے آج کے دن بھی — تمہیں بتاؤ کہ پھر اوسکی عید کیونکر ہو

۲

کھلے جو میکدہ ساقی کی دید ہو جائے — یہ روزِ عید کا روزِ سعید ہو جائے
یہ ایک ایک سے کہتا ہے ہجر میں میکش — جو وہ ملیں تو ہماری بھی عید ہو جائے

عید کا خط

"نظم متعلق تصویر"

(از جناب محمد سردار حسین صاحب بہزاد لکھنوی)

آراستہ ہے کمرہ بیٹھی ہے اک حسینہ
ہاتھون مین اک قلم ہے ماتھے پہ ہے پسینہ
دل مین بھرا ہوا ہے شکوون کا اک خزینہ
کاغذ پہ لکھ رہی ہے کس کام کا یہ جینا؟
لو عید آگئی ہے ہے عیش کا مہینہ
آتے نہین ہو اب بھی یہ کون ہے قرینہ؟
فرقت مین مر رہی ہون کھانا ہے اور نہ پینا
بحر غم و الم مین ڈوبا مرا سفینہ
یون دل مین جلوہ گر ہو اے حسن تجھ سے سینہ
انگشتری پہ جیسے ہو جڑے کوئی نگینہ

لو یوم عید آیا مجھکو گلے لگا لو
فرقت مین دل ہے مردہ آکر اسے جلا لو

"عید کا خط"

عِید کا خط

خیالی گنج - شہر دماغ
یکم شوال ۱۳۴۹ھ

میرے سرتاج

تم کہتے ہو کہ "عید مبارک" تو خیر مین بھی مانے لیتی ہون۔ مبارک ہو۔ مجھ سے بڑھ کے تمکو مبارک ہو۔ کیونکہ مجھے عید تو جبھی مبارک ہوتی کہ اس خط کے بدلے تم آتے اور اس کاغذ پر چھپے ہوئے چاند کے عوض مین تمھارا مکھڑا دکھائی دیتا۔

تم تھے تو دن عید، رات شبرات تھی، اب تم جمی جم ہو تو عید بھی عید نہین۔ کل مین نے عید کا چاند دیکھا اور بڑی دیر تک آنکھین بند کئے دعا مانگا کی کہ مین اپنے چہرہ پر سے ہاتھون کو ہٹاؤن تو سامنے تم کھڑے ہو" مگر ایسی دعا کب قبول ہوتی ہے۔

اسی سے تو مین تمھارا عید نامہ بھی ساتھ لیتی گئی تھی اور چاند دیکھ کے سب سے پہلے یہی خط دیکھا۔ بس میری عید تھی تو اتنی۔

یون تو کہنے کو سب کہتے ہین کہ "آج عید ہے" مگر جو سچ پوچھو تو میری عید کا چاند تم ہو جسے مین عید سمجھتی ہون وہ اسی دن ہوگی جس دن تم آؤ گے۔ "دیکھون میری عید کب ہوتی ہے"

عید مین کہتی ہون جسکو وہ تو کوسون دور ہے
ہان مبارکباد دینے کیلئے آئی ہے عید

عید مین عید کی منتظر
تمھاری ب.........

خیالی ہندوستان مین

(از مولانا ہدف اجتہادی لکھنوی)

ایک دن "شالا مار" مین فطرت کے بچھائے ہوئے بچھونے پر درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ گرمیون کا زمانہ، دوپہر کا وقت، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مہین مہین گھاس پر کھنچی ہوئی جسپر سارے جسم کا بوجھ تھا اور باغ کی مٹتی ہوئی تصویر اپنے ابتدائی نقش و نگار کی یاد دلا رہی تھی کہ یکایک خیال آیا مین کون ہون، کیا ہون" میرے ہندوستانی ہونے مین تو کلام ہی نہین مسلمان ہون، یہ بھی سب جانتے ہین عالی خاندان ہون، یہ میرے نام سے ظاہر ہے اور خاندان بھی کونسا خاندان جو ابھی تھوڑے دنون پہلے اسی ہندوستان پر حکمران تھا جسکے ایک زبردست تاجدار کی یادگار یہ باغ بھی ہے سوائے شاہزادہ کے اور کون "ہر فن مولا" ہو سکتا ہے"؟ ......

بیشک میرا خیال ٹھیک ہے، خوب یاد آیا، اکثر نانی جان شاہی کی باتین کرتی ہین تو بادشاہون کے نام کے ساتھ ساتھ اپنا شجرہ بھی لیتی جاتی ہین یہ سب کے سب اُن کے باپ دادا تھے تو میرے بھی ہوے۔ پھر مجھ مین کیا بات ہے جو مین اُن کا سا نہین۔ یہی نا کہ میرے نام کیسا تھ "شاہ" نہین۔ تو مین اسے حاصل کرون گا۔ اگر مرد ہون تو بغیر حاصل کئے نہ رہون گا۔

لیکن اسکے حصول کی کیا صورت ہونا چاہیئے مصطفےٰ کمال پاشا اور رضا شاہ پہلوی کی طرح نوکری کرون اور بتدریج ترقی کرتے کرتے بادشاہ بنجاؤن؟

نہین، یہ تو مجھ سے کبھی نہوگا۔ جسکے باپ دادا کے یہان ہزارون لاکھون نوکر چاکر رہ چکے ہون وہ دوسرون کی چاکری نوکری کرے۔ تو پھر کیا انگریزون کی طرح تجارت شروع کردون اور اسی بہانہ سے چپکے چپکے ملک بھر مین قبضہ کرلون؟ مگر نہین، انگریز تو ہین بنیے، مجھ سے یہ بھی نہوگا۔ یہ میری شان کے خلاف ہے۔ تو پھر کیا اپنے سارے خاندان اور شاہی نمک خوار خاندانون کو جمع کرکے جہاد کردون اور تلوار کے زور سے اپنا موروثی ملک حاصل کرلون؟ یہ بھی نہین جس رعایا کا خون میرے بزرگون نے نہ بہنے دیا اُس کا خون مین دشمنون کے ہاتھون بہاؤن۔ مجھ سے یہ بھی نہوگا۔ پھر کیا ادیب بنجاؤن اور اپنی پرزور نظم و نثر سے انقلاب کردون؟ یہ صورت عمدہ اور آسان ہے۔ فارسی میری پدری زبان، سنسکرت مادری زبان۔ عربی مذہبی زبان ہے بچپن مین قرآن شریف پڑھ ہی چکا ہون، ان سبکا مجموعہ اُردو ہے جسپر حاوی ہوجانا میرے لئے کوئی بات ہی نہین۔ بہت جلد ہندوستانیون کے دلون کو مسخر کرلون گا۔ دلپر حکومت حاصل کرلینے کے بعد حصول مقصد مین کوئی دشواری نہین رہتی۔ مگر نہین، دیکھو کے ہندوستان کے بہت سے ادیب صرف شاعری و نثاری کی بدولت روٹیون سے لگے ہوے ہین۔ کیا حالت ہوگی

اُن بیچاروں کی جو میرے تسخیر قلم کے بعد بھوکون مرینگے۔ کیا اُن کے متعلقین مجھے گود بھیلا بھیلا کے نہ کوسینگے۔ مجھ سے غریب آزاری نہیں ہوسکتی۔

تو پھر کیا لیڈر بنجاؤں اور اپنی دھوان دھار تقریروں سے کایا پلٹ کردوں۔ یہ بھی نہیں ہندوستان میں چار، پان، مٹھائی وغیرہ وغیرہ تک تو ہندو مسلمان ہیں۔ اتحاد ہوگا تو کیونکر اور بغیر اتحاد کے حصول مقصد ناممکن ہے۔

پھر کیا ہو شاہی بہرحال حاصل کرنا ہے۔ ایک ترکیب ہوسکتی ہے اور یہی سب سے اچھی ہے۔ نانی جان کہا کرتی ہیں کہ ہندوستان میں ایک چڑیا ہوتی ہے "ممولا" اسکے سر پر چوٹی ہوتی ہے جسکے پاس یہ چوٹی ہو وہ سبکو دیکھ سکتا ہے اور اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے تو "ممولا" ہمیشہ نہیں دکھائی دیتی۔ جاڑوں میں اسکی چوٹی گرجاتی ہے تو سبکو دکھائی دینے لگتی ہے، گرمیوں میں چوٹی نکل آتی ہے تو نظروں سے غائب ہوجاتی ہے۔

بس اسی کو کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا چاہئے پھر تو میں سبکو دیکھوں گا، مجھے کوئی نہ دیکھے اور جو چاہوں گا کروں گا۔

اسی طرح اپنے خیالستان میں ممولا کو پکڑنے کیلئے چکر لگانے لگا نیند آگئی۔ سوتے ہی جاڑا آگیا اور "شالامار" کے چمنوں میں ممولائیں چگنے دکھائی دینے لگیں۔ پھر کیا تھا دوڑا ہوا گھر پہنچا، اور ایک ٹوکری، تھوڑی سی ڈور، ذرا سے چاول لاکے ٹھکی لگادی بس ٹھکی لگانے کی دیر تھی کہ ممولا آن پھنسی۔ میں اُسے گرفتار کئے ہوئے گھر لایا اور ایک پنجری میں بند کرکے لٹکا دیا۔ روز صبح کو اُٹھکے سب سے پہلے پنجری دیکھتا تھا کہ ممولا کی چوٹی نکلی کہ نہیں اسی طرح بہت سے دن گذر گئے، ایکدن جو اُٹھکے دیکھتا ہوں تو ممولا پنجری میں نہیں، میں سمجھ گیا کہ چوٹی نکل آئی۔ میری اسوقت کی خوشی کا کیا پوچھنا جلدی سے پنجری میں ہاتھ ڈال کے ممولا کو پکڑا اور سر ٹٹول کے چوٹی کاٹ لی چوٹی کیا ملی گویا ہندوستان کا تاج مل گیا خوشی خوشی اُسکا تعویذ سی کے ٹوپی میں ٹانکا۔ اور سب سے پہلے گھر والوں پر آزمائش کی کہ دکھائی دیتا ہوں یا نہیں۔

جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا تو کچھ دنوں کی محنت میں ایک "آئین نامہ" تیار کیا جسکو بندہ ہندوستان کو چلانا تھا۔ اسکے بعد سارے ملک کا دورہ کیا اور ہندوستان کے تمام باثر اشخاص سے اس وعدہ پر معاہدہ وفاداری لکھوایا کہ میں اکیلا ہندوستان کو آزاد کرالوں گا۔

یہ لوگ دستخط کرتو دیتے تھے مگر مسکے اور مجھے ان کی ہنسی پر ہنسی آتی تھی۔ آخر وہ دن بھی آگیا کہ میں اپنا کام شروع کردوں۔ مجھے کوئی دیکھ تو سکتا ہی نہ تھا اسلئے نہایت اطمینان سے پہلے تو چپکے چپکے ہوائی جہازوں کی مشینیں خراب کیں پھر جنگی جہازوں کے پیندوں میں چھید کئے پھر تمام سامان جنگ اٹھا اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا اسکے بعد ایک ایک انگریز کو چن چن کے پکڑا اور سلامتی سے لندن میں چھوڑ آیا۔

جب ان سب کاموں سے فرصت مل گئی تو اپنے سر سے ٹوپی اتار کے سب کے سامنے آگیا اور تمام ہنسنے والوں کو جھک جھک کے فخریہ سات سات تسلیمیں کیں۔ میری جادو نما کارگذاریوں سے ملک بھر میں ہل چل تو پڑی ہی تھی جب میں نے ظاہر ہو کے اپنی کارستانیاں بتائیں تو سبکو اچنبھا ہوگیا۔

پھر کیا تھا، بچہ بچہ میرا دم بھرنے لگا اور دہلی کے قلعہ میں لیجاکے مجھے ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا خوشی میں آنکھ جو کھلی تو

"پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر"

کیون!

(از جناب سید سجاد علی صاحب رضوی)

(خاص نظارہ کیلئے)
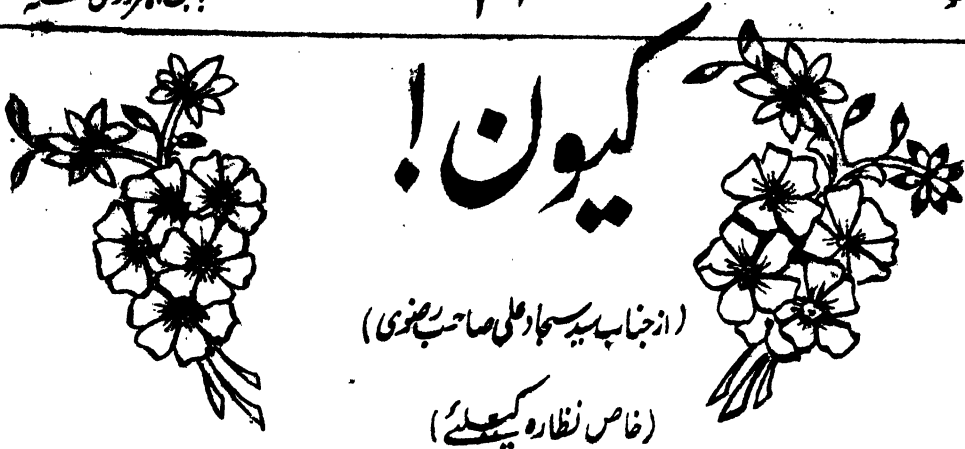
ایک دن سر اسحاق نیوٹن اپنے باغ مین بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرا۔ یہ ایک معمولی واقعہ تھا لیکن اوس نے اس فلسفی کے دماغ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ نیوٹن نے خیال کیا "سیب شاخ سے جدا ہونے کے بعد اپنی جگہ قائم نہین رہا اوپر کی طرف نہین گیا کسی اور سمت بھی نہین گیا۔ بلکہ زمین کی طرف .... کیون ؟" دنیا جانتی ہے کہ مسئلہ کشش ثقل کا دریافت کرنے والا نیوٹن ہے لیکن اس راز کی کنجی کیا تھی .... کیون ؟ علوم و فنون کی بنیاد کیا ہے ...... کیون ؟ فلسفہ و منطق کا دریا جس کوزہ مین بند ہے وہ کیا ہے .... کیون ؟

انسان اگر معمولی معمولی واقعات پر غور کرے تو بڑے بڑے نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ دنیا کا کوئی راز ایسا نہین ہے جس پر کیون؟ کی چید لالٹین کی روشنی پڑے اور وہ راز۔ راز رہے۔

(۱)

دن بھر کی تفتیش کے بعد احمد علی سب انسپکٹر خفیہ پولیس اپنے گھر واپس آئے۔ کمرہ کھول کر روشنی کی۔ میز پر کاغذات ڈھیر تھے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور گذشتہ واقعات پر غور کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد رپورٹ لکھنے کیلئے میز پر سے پنسل اٹھائی لیکن دیکھا تو وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ ایک معمولی واقعہ تھا۔ اور اگر احمد علی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ ذرا سی بھی توجہ نہ کرتا لیکن احمد علی کا اصول مختلف تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتون کو بھی نظر انداز نہ کرتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ معمولی معمولی واقعات سے بڑے بڑے نتائج اخذ ہو سکتے ہین۔ یہی وجہ تھی کہ انھون نے جس معاملہ کو ہاتھ مین لیا پورا کر کے چھوڑا۔ کامیابی کے سوا کبھی ناکامی کا منحوس منھ نہین دیکھا چارون طرف اون کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے ہم پیشہ لوگون مین بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بدمعاشون کا ان کے نام سے دم نکلتا تھا جس حلقہ مین تعینات ہوتے تھے۔ وہ ادھر کا رخ کرتے ہوے ڈرتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی پنسل کو بغور دیکھتے ہوے احمد علی نے خیال کیا " ابھی صبح کو تو مین نے پنسل بنائی تھی۔ دیکھو قلم تراش کے تازہ نشانات اس پر موجود ہین "

ردی کی ٹوکری مین کچھ ڈھونڈھتے ہوے " مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مین نے صبحکو پنسل بنائی تھی۔ ردی کے ٹکڑے مین بھی

چھلے ہوئے پنسل کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں پنسل پر قلم تراش کے تازہ نشانات بھی میرے خیال کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اسلئے یقیناً میں نے یہہ پنسل صبح کو بنائی تھی۔ اور وہ تمام دن اس میز پر موجود رہی۔ کمرہ مقفل تھا اسلئے کوئی دوسرا یہان آیا بھی نہیں۔ اسوقت مجھے یہہ پنسل ٹوٹی ہوئی ملی .... کیون؟" احمد علی کسی خیال میں غرق آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ دیر تک ساکت بیٹھے رہے۔ پھر کچھ خیال کرکے اُٹھے میز کے تمام کاغذات اُلٹ پلٹ کر ڈالے۔ ہر جگہ تلاش کیا فرش کا کونہ کونہ چھان ڈالا لیکن پنسل کے مفقود حصہ کا ٹکڑا نہ ملنا تھا نہ ملا۔

(۲)

آخر کار احمد علی تلاش سے عاجز آکر اپنی جگہ پر پھر بیٹھ گئے۔ انکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پنسل کس طرح ٹوٹی اور دوسرا ٹکڑا کیا ہوا؟ اُنھون نے خیال "شاید یہان میری غیر موجودگی میں کوئی شخص یہان آیا ہو اور اسنے پنسل سے کچھ لکھا ہو لیکن اُس نے قفل کیونکر کھولا۔ اگر جعلی کنجی سے قفل کھولا گیا تو آنے والے کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اور اگر کوئی یہان آیا تھا تو .... کیون؟" یہ خیال کرکے نوکر کو آواز دی خدا بخش! خدا بخش! کئی آوازیں دیں لیکن جواب ندارد۔ خیال ہوا کہ رات زیادہ آگئی ہے ممکن ہے سوگیا ہو۔ فوراً کھڑے ہوئے اور خدا بخش کی کوٹھری کے پاس گئے لیکن وہ خالی پڑی تھی۔ رات گئے باہر جانا خدا بخش کی عادت کے خلاف تھا وہ احمد علی کا قدیم نمک خوار تھا۔ انھیں اسکی وفاداری پر کامل اعتبار تھا اسلئے کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کر سکتے تھے جھنجھلاتے ہوئے اپنے کمرے میں واپس آئے۔ جلدی جلدی کپڑے پہن کر باہر نکلنے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ خدا بخش کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھا۔ غصے میں تو بھرے ہی ہوئے تھے۔ صورت دیکھتے ہی برس پڑے "تو کہان گیا تھا اُسوقت؟" پھر دل ہی دل میں اپنی سختی پر نادم ہو کر بہ مذاق لہجے "آپ نا وقت کہان تشریف لیگئے تھے؟" نوکر نے اپنے آقا کی طرف عجیب انداز سے دیکھا۔ اسنے محسوس کیا کہ میرے غائب ہونے سے بہت بڑا نقصان ہوا ہے جسکی وجہ سے میرے آقا اسقدر ناراض ہیں۔ وہ اسقدر بوکھلا گیا کہ اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا "میان کہین نہین" احمد علی اسکے اس جواب سے اور برانگیختہ ہوئے لیکن اُنھون نے غصے کو ضبط کرکے کہا "کہین نہین گئے تھے پھر کہان سے آرہے ہو؟" خدا بخش نے اس موقع کو غنیمت سمجھکر کہنا شروع کیا "میان کہین سے نہین "ابھی تھوڑی دیر ہوئی ایک صاحب آپکو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ صورت سے شریف آدمی معلوم ہوتے تھے۔ مجھسے کہنے لگے میان ہین۔ مین نے کہا کہین گئے ہوئے ہین۔ آپ باہر کمرے مین بیٹھے آتے ہونگے۔ اُنھون نے کہا۔ اچھا مین یہان بیٹھتا ہون تم ذرا چوراہے تک چلے جاؤ۔ وہان تمکو ایک گاڑی والا ملیگا۔ اسکو یہ روپیہ دیدینا اور کہدینا کہ وہ چلا جائے مین چوراہے تک گیا وہان ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ مین نے گاڑی والے کو روپیہ دیدیا اور واپس آرہا تھا کہ آپ مل گئے۔" احمد علی کو یقین آگیا کہ خدا بخش سچ کہتا ہے لیکن اُنھون نے تنبیہا کہا "خدا بخش تم نے بہت بڑی غلطی کی تم کو ہرگز نہ جانا چاہیے تھا۔" نوکر نے اسکے جواب مین گردن نیچی کرکے سر کھجلانے لگا۔

---

(۳)

احمد علی اپنے کمرے مین بیٹھے ہوئے گذشتہ شب کے واقعہ پر غور کر رہے تھے "مجھے خدا بخش کے بیان پر یقین ہے۔ کیونکہ جب مین آ رہا تھا تو گلی کے موڑ پر ایک شخص مجھے تیزی سے جاتا ہوا ملا تھا۔ مجھسے مڈبھیڑ ہونے کے بعد وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور اسکے منھ پر ہوائیان اُڑنے لگی تھین اس کی اس عجیب حرکت پر میرے دل مین سوال پیدا ہوا تھا...... کیون لیکن وہ شخص جلدی سے سنبھلکر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گیا تھا۔ خدا بخش نے آنے والے کا حلیہ بیان کیا ہے وہ اس سے ملتا جلتا ہے۔ خدا بخش کہتا ہے وہ مجھسے ملنے آیا تھا لیکن وہ تو مجھے دیکھکر حواس باختہ ہو گیا ہو گیا تھا...... کیون؟ اس نے خدا بخش کو چورا ہے تک دوڑا دیا۔ اور موقع خالی پا کر کمرے کا قفل کھولا۔ کچھ لکھنے مین پنسل ٹوٹ گئی۔ پنسل کے مسالہ کا ٹکڑا غائب ہو گیا...... کیون؟" احمد علی کو ان سوالون کے جواب پر اس معمہ کا حل منحصر ہے۔ اُنھون نے خیال دوڑانا شروع کیا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ جسکو میرے کاغذات سے دلچسپی ہو۔ ایک عرصہ گذرا کہ احمد علی نے ایک مقدمہ مین کافی شہرت حاصل کی تھی بدمعاشون کے ایک جتھے کا پتہ لگایا تھا جو کئی جرائم اور خون کر چکا تھا۔ پورا جتھا گرفتار ہو گیا اور اپنے کیے کی سزا بھگت رہا تھا۔ لیکن ایک کانٹا تھا جو احمد علی کے دل مین کھٹک رہا تھا۔ ان مین سے ایک شخص جو حد درجہ چالاک اور خون کرنے مین بیباک تھا۔ ابھی تک آزادی کی ہوا کھا رہا تھا۔ احمد علی کو اس خطرناک شخص سے ضرر کا اندیشہ تھا اسلئے عرصہ تک اسکی گرفتاری کی کھوج مین رہے لیکن وہ بھی بلا کا فطرتی تھا۔ کبھی انکے ہتھے نہ چڑھا۔ بہت دنون سے وہ لاپتہ ہو گیا تھا اسلئے احمد علی اسکی طرف سے بے خبر ہو گئے تھے۔ لیکن اس تازہ چھیڑ نے انکو ہوشیار کر دیا کہ دشمن گھات مین ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ انکو یقین ہو گیا کہ آنے والا اس خطرناک شخص کے سوا کوئی دوسرا ہو نہین سکتا۔

(۴)

احمد علی کو اپنے دشمن کی قوت کا اندازہ تھا۔ اُنھون نے جتنی تدبیرین اپنی حفاظت کی ممکن تھین اُٹھا نہ رکھین۔ سوتے وقت کھڑکیان اور دروازے احتیاط سے بند کر لیتے تھے۔ اکثر راتین شب بیداری مین بسر کرتے تھے اور ذرا سی آہٹ پر چوکنا ہو جاتے تھے۔ لیکن ابھی تک وہ یہ نہ معلوم کر سکے تھے کہ وہ انکے کمرے مین کیون آیا تھا۔ اور اس نے پنسل سے کیا لکھا۔ گذشتہ مقدمہ کی پوری مسل دیکھ ڈالی تمام متعلق کاغذات دیکھے بھالے لیکن ہر چیز ٹھکانے سے موجود تھی۔ اس فکر مین غلطان بیٹھے ہوئے تھے کہ خدا بخش ایک تار اُنکے سامنے لا کر رکھدیا۔ تار مین یہ مختصر مضمون تھا۔ "جلدی میری مدد کو آئیے۔ دشمن تاک مین ہین میری جان خطرہ مین ہے۔"

راقم رشید

احمد علی نے تار پڑھکر کہا "یا اللہ یہ رشید صاحب کون ہین۔ نام سے کان ضرور آشنا معلوم ہوتے ہین۔ لیکن یاد نہین آتا۔ ا ہا ہا۔ ابھی تو مین مقدمہ کی مسل مین انکا نام پڑھ چکا ہون۔ یہ بھی ملزمین مین شامل تھے لیکن سرکاری گواہ بن گئے تھے میرے خیال مین دشمن سے مراد انکے قدیم دوست ہین۔ جنھون نے میرے حال پر بھی عنایت کر رکھی ہے۔ مین تو سمجھا تھا کہ پہلا شکار مین ہونگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پہلا ہاتھ رشید پر صاف کیا جائیگا۔ اچھا اب مین سمجھا وہ یہان رشید کا پتہ دریافت کرنے آیا تھا جو وہ مسل سے نقل کر لے گیا۔ مجھکو رشید کی مدد ضرور کرنا چاہیے ورنہ

اسکے بعد میری باری لگ ئے گی۔ تو اپنے دل مین یہ طے کرکے احمد علی فوراً چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے باہر نکلے کہ انکا کوئی پیچھا تو نہین کر رہا ہو۔ ایک ٹیکسی مین بیٹھکر ڈرائیور سے غیر معروف راستون سے اسٹیشن چلنے کے لئے کہا۔ انکو اب اطمینان ہو گیا کہ انکی نگرانی کوئی شخص نہین کر رہا ہو۔ شام کا وقت تھا چراغ جل چکے تھے ٹیکسی تیزی سے جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ سامنے سے ایک دوسری ٹیکسی تیز رفتاری سے انکی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ ڈرائیور نے ہارن بجانا شروع کیا لیکن دوسری ٹیکسی بڑھتے بڑھتے بہت قریب آگئی ایک دہشتناک آواز کے ساتھ دونون گاڑیون مین تصادم ہوا۔ احمد علی کو معلوم ہوا کہ آسمان پھٹ کر زمین پر گر پڑا اور انکی آنکھون مین اندھیرا چھا گیا جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اسپتال مین پڑے ہوئے ہین چوٹ زیادہ نہین آئی تھی لیکن ناگہان صدمہ سے غش آگیا تھا۔ اور تمام رات بیہوش پڑے رہے تھے۔ تصادم کے متعلق پوچھنے سے معلوم ہوا کہ انکی ٹیکسی کا ڈرائیور نیمجان حالت مین پڑا ہوا ہے اور دوسری ٹیکسی کا ڈرائیور لاپتہ ہے معلوم ہوتا ہو تصادم ہونے سے پہلے وہ ٹیکسی سے بھاگ چکا تھا جس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ اتفاقاً واقع نہین ہوا۔ بلکہ عمداً انکے جان لینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن خدا کا فضل شامل حال تھا بال بال بچ گئے۔ احمد علی رشید کیلئے بہت متفکر تھے سوچتے تھے۔ نہ معلوم بیچارے کا کیا حشر ہوا اسپتال سے نکلتے ہی اسکے وطن کا رخ کیا لیکن وہان پہونچکر معلوم ہوا کہ رشید کئی دن سے لاپتہ ہے اب کیا کر سکتے تھے۔ مجبور ہو کر واپس چلے آئے۔ دوسرے دن بیٹھے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے کہ ایک خبر پر نظر پڑی جو رشید کے وطن کی تھی۔ "دو سڑی ہوئی لاشین آبادی سے دور ایک کنوئین سے برآمد ہوئی ہین۔ ابھی تک شناخت نہین ہو سکی۔ کپڑون سے ایک لاش کی کچھ شناخت ہوئی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ وہ وہین کا رہنے والا تھا اسکے سینے پر پستول کی گولی کا زخم بھی موجود ہو۔ یہ شخص کئی دن سے لاپتہ تھا۔ دوسرا کوئی اجنبی ہو۔ اس واقعہ سے قرب و جوار مین سنسنی پھیلی ہوئی ہو۔ پولیس تفتیش کر رہی ہو" احمد علی کے ہاتھ سے اخبار چھوٹکر گر پڑا فوراً اسٹیشن پہونچے اور رشید کے وطن روانہ ہو گئے۔ وہان پہونچکر دونون لاشون کا معائنہ کیا۔ کپڑون کی تلاشی لینے پر اجنبی کے جیب سے ایک نوٹ بک نکلی جسکو کھولا تو ایک صفحہ پر پنسل سے مٹی ہوئی عبارت مین رشید کے وطن کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ احمد علی جب عبارت پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے تو کوئی چھوٹی سی چیز انکے پیرون کے پاس گری۔ اٹھا کر جو دیکھا تو پنسل کے مصالحہ کا ٹکڑا تھا۔ انھون نے اپنے دل مین خیال کیا۔ "اس پنسل کے ٹکڑے نے سارا معمہ حل کر دیا میرے دل کا کانٹا نکل گیا۔ اب مین چین سے زندگی بسر کر سکتا ہون معلوم ہوتا ہو کہ رشید کا کام تمام کرنے کے بعد اسکا دشمن جب اسکی لاش کنوئین مین پھینک رہا تھا تو اوسکی بھی ٹانگ پھسل گئی اور مقتول کے ساتھ قاتل کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس طرح قدرت نے رشید کے خون کا انتقام لے لیا"

گندم از گندم بروید جو ز جو

از مکافات عمل غافل مشو

شامِ عید

(از نتیجۂ فکر جناب سید علی یاور صاحب صفدر لکھنوی)

جلوہ گر ہی بزم انجم مین ہلال شام عید
بارگاہ حسن سی جاری ہوئے احکام عید

آ گیا یون ساکنان ارض کو پیغام عید
چرخ پر خطِ ہلالی مین ہی ظاہر نامِ عید

چاند کی رویت نے منزل آنکھ کی آباد کی

گونج اٹھین ہر سمت آوازین مبارکباد کی

اے مرے ساقی پلا جام شراب لالہ فام
میکدے کے در پہ ہین کچھ میکشان تشنہ کام

آج رخصت ہم غریبون سی ہوا ماہ صیام
بزم مین اب تو کہان ہو کیون نہین گردش مین جام

ساغر مے سی کرین کیونکر نہ ہم افطار صوم

کہہ رہا ہی اب زمانہ بھر کے ہمین میخوار صوم

چل کے دیکھین صحن عالم کی ذرا آرائشین
کہہ چکو اب اے را اپنا درد دل کب تک کہین

سر زمین میکدہ پر کس لئے بیٹھے رہین
دل اگر ہے سیر پر مائل تو گلشن مین چلین

وان حسینان چمن بھی ہین گلے ملتے ہوئے

بھر رہے ہین دامنون مین پھول کچھ کھلتے ہوے

کوئی اپنے عہد کا یوسف کوئی ماہ کمال　　　کوئی اپنے حسن پر نازان کہ ہم ہین بے مثال

ہر کوئی مغرور جلوہ اس طرح محو خیال　　　خود ہماری دید کو اب چرخ پر آیا ہلال

آنکھون ہی آنکھون مین گردون سے اشارے ہو گئے

پھول ہاتھون سے زمین پر گر کے تارے ہو گئے

دیکھ تو کیسا یہ ماہ نو فلک پر ہے عیان　　　یا کسی نے رخ سے الٹی ہے نقاب ضو فشان

کیون جھکے ہین بہر جلوہ خود نجوم آسمان　　　مثل موسیٰ ہم کو لیکن تاب "نظارہ" کہان

کچھ نہین معلوم پھر بھی اشتیاق دید ہے

سنتے ہین اک زیر گردون بھی ہلال عید ہے

جلوہ گاہ ناز مین اے صد پردہ ہین بے نقاب　　　مہر عالمتاب ہے گویا وہ حسن لاجواب

شرم سے کیون کم نہ ہو آخر بہائے ماہتاب　　　حسن دلکش سے زمانہ ہو رہا ہے فیضیاب

اہل عالم تم بتا دو کس کا پیارا چاند ہے

اک فلک کا چاند ہے اور اک ہمارا چاند ہے

مومن کی شاعری

(بسلسلہ اشاعت گذشتہ)

(السید ادم صاحب رضوی الناظری سیتاپوری)

غیروں پہ کھل نہ جائے کہین راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

یہ شعر مومن کے اس خاص رنگ مین کہا گیا ہی جسکو اب درجہ امتیازی حاصل ہی یہ شعر مومن کی شاعری کو ملحوظ رکھتے ہوئے درصل اچھا ہی لیکن جب بنیاد ہی کمزور تو تعمیر کا شکوہ بیکار۔

سمجھ مین نہین آتا کہ اس غمزۂ غماز سے کیا مراد ہی، جب فاعل خود ہی موجود ہی تو فعل سے تخاطب کیسا غماز کی موجودگی مین غمزہ سے خواہش رحم کرنا ان فطری منازل کی بلند ترین گھاسون کی کامیاب رہبری ہی جو الہامات شاعری کہلاتے ہین۔

تلخ کامی پر مجھے تجھکو لب شیرین پہ ناز — آمرے جادو سے اعجاز مسیحائی ملا

ایک طرف اپنی تلخ کامی پر غرہ۔ دوسری جانب معشوق کے لب شیرین کے ناز سے تقابل کا چیلنج مصرع ثانی مین جادو و اعجاز کا فرق دکھلا کر اس مسئلہ کو حل کر دیا ہی کہ حقیقت یہ ہی اور مجاز یہ لیکن قافیہ کی ٹھونس ٹھانس ایسی کی گئی ہی کہ سمجھ مین نہین آتا کہ کاتب نے کیا کو کیا لکھدیا خواہ مخواہ کے اعجاز مسیحائی نے سارا شعر برباد کر دیا۔

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا — دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

سبحان اللہ! شعر مین شوخ کسے کہا ہی اور بیحیا سے کیا مراد ہی اگر شوخ سے مراد معشوق ہی تو بیحیا جانا سے مراد بے محل ہی اس مصرع کو نثر مین اس طرح بھی پڑھ سکتے ہین کہ بیحیا شوخ کہتا ہی یا بیحیا جانا کہتا ہی اور پھر دوسرے مصرع کے دیکھو کا لفظ دیکھو محبت کے پیرایہ مین کہا گیا ہی مناسبات شاعری سے ہر بات گری ہوئی۔

اوسکے روٹھتے ہی ہم جہان سے روٹھے — کیا قیامت ہی دل کا آجانا۔

مصرع اولی مین یہ نہین معلوم کہ معشوق کہان سے اوٹھا جسپر عاشق مرگیا۔ (یا جہان سے روٹھ گیا) ایسی صورت مین شعر نہایت مجمل معما ہی اور لطف شاعری باقی نہین رہتا۔ ؎

ہے نہ او تری گلے سے جو اوس بن — مجھکو یار و نے پارسا جانا۔

پارسائی کی کیا دلیل پیش کی ہی اگر ایسے ہی مصنوعات پارسائی کی تقدیس کیلئے آسکتے ہین تو سبحان اللہ ؎

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا تونے مومن بتون کو کیا جانا

مومن نے اس موقع پر شکوہ بے نیازی سے ناجائز فائدہ اوٹھانے کی ناکام کوشش کی ہے اور دوسرے مصرعہ مومن اور بتون کا استعمال کردیا ہے لیکن بتون کی بے نیازی ایک نئی بات ہے خدا بے نیاز سمجھا جاتا ہے نہ کہ بت بے نیاز کر دیے گئے ہون اون کیلئے اور بہت سے خطاب موجود ہیں

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

تنہائی کی خصوصیت نے عاشق کے خیالات کا راز افشان کر دیا یعنی جسوقت تنہائی ہوتی ہے تو مجھے تیرے وجود کا گمان ہوتا ہے لیکن عشق کے مدارج ہی اور ہیں اور تقاضائے الفت یہ نہین کہ عاشق معشوق کو کسی وقت اپنے سے جدا سمجھے ۔ ف

حال دل یار کو لکھون کیونکر ہاتھ دل سے جدا نہین ہوتا

کیا توجیہ قائم کی ہے ۔ ف

دامن اوس کا جو ہے دراز تو ہو دست عاشق رسا نہین ہوتا

دعوائے محبت خود کوہے لیکن اظہار محبت کی خواہش معشوق سے ۔ یہی مسئلہ اس شعر مین درپیش ہے یعنی درازی دامان معشوق اسکی ملتجی ہے کہ دست عاشق بڑھے ۔ اس شعر مین درازی داماں کی کوئی وجہ نہین دکھلائی گئی اگر عموماً معشوق کے دامن لانبے ہوتے ہین تو تو اوس معشوق کی نئی شان ہے اور ایسی معشوقیت عامیانہ ہے ۔ ف

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا مرنا ہی مقدر تھا وہ آئے تو کیا ہوتا

معشوق کو زیر بار احسان یہ کہکر کیا جارہا ہے کہ گو کہ اوسکے آنے سے کچھ فائدہ نہ تھا کیونکہ مرجانا قسمت ہی مین تھا لیکن اون کے ایفا عہد پر جان فدا کرتے یہی پیچیدہ مسئلہ مومن نے آسین حل کیا ہے جسمین اپنی فطرت سے ایسی بندش کی ہے جس سے احسان بھی جتایا جاتا ہے لیکن پھر یہ کہکر کہ مرنا ہی مقدر تھا سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا ہے اور جان کا فدا کرنا وغیرہ سب تشریف لیجاتا ہے ۔ ایسی ہی ٹھونس ٹھانس ایسے موقع پر کی جاتی ہے جہان عاشق کی منزلت شاعر کے ذہن سے دور ہوتی ہے ۔ ف

اس حسن پہ خلوت مین جو حال کیا کم تھا کیا جانے کیا کرتا اگر تو سری جا ہوتا

مضمون نہایت عمدہ اور امیر مینائی کے رنگ مین ہے ۔

ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اس کا کیونکہ لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا

محض نظم کر دینے سے منازل شاعری طے نہین ہو سکتے مضمون کچھ چاہتا ہے بندش کچھ کہتی ہے تخئیل کا پیشہ نہین کیا کیا جائے قاصد کا پیام پہونچانا کہین سے ثابت نہین جواب خواہ مخواہ سمجھ لیا جائے ۔

باقی آئندہ

بادہ کشون کی عید

(از جناب اسرار انصاری صاحب ایڈیٹر میخانہ)

میکدہ پر آرہا ہے جھوم کر ابر سیاہ
عید ہے بادہ کشون کی آج سب آنکھوں پناہ

کوئی بوتل ہے لئے اور کوئی پیمانہ لئے
پتلیون مین آنکھ کی ہر کوئی میخانہ لئے

عید کا دن ہے خوشی مین مست ہر میخوار ہے
جسکو دیکھو بیخود و مدہوش ہے سرشار ہے

جوش مستی سے کسی کا پاؤن تھمتا ہی نہین
رنج و غم کا آج کوئی رنگ جمتا ہی نہین

آج دنیا کی ہر اک شی سے ظہور کیف ہے
جس کا دل مغموم ہے وہ قابل صد حیف ہے

روئے ساقی سے ہویدا لطف کے آثار ہین
جسکے نظارہ سے بیخود آج سب میخوار ہین

خوش ہر اک میخوار ہے ساقی رنگین ادا
آج ٹھنڈا پڑ گیا ہر بانی جور و جفا

گھومتا ہے سر دفور نشہ سے ہر ایک کا
فرق ذرہ بھر نہین ہمین برے اور نیک کا

دیکھنے والے بھی ہین سرمست کیف چشم یار
ہو رہے ہین لذت باکیف سے وہ ہمکنار

فکر اون کو ہے سرو پا کی نہ مطلب نام سے
کام ہے اون کو اگر کوئی تو ہے کام سے

سچ پوچھو تو اونھین کی عید تو بس عید ہے
جنکی ہر سحر شام صبح عیش کی تمہید ہے

شاہی چور

از جناب خواجہ عشرت صاحب لکھنوی

میر غلام عباس لکھنؤ کے قدیم باشندے اور ایک شریف سید کے بیٹے تھے صورت شکل اچھی گورے چٹے میانہ قد کم رو نحیف الجثہ تعلیم یافتہ وضعدار دوست نواز علم مجالس سے واقف باتیں ایسی لچھے دار کہ پہروں سنا کیجیے معمول یہ تھا کہ سہ پہر کو چوک کی ہوا کھانے ضرور نکلتے تھے جالی کا کرتہ اور شربتی کی اچکن کندھے پر چکن کا رومال ہاتھ میں فیروزے کی انگوٹھی دو پلی چکن کی ٹوپی گھڑی میں سونے کی زنجیر دیکھنے میں شریف رئیس معلوم ہوتے تھے مگر اس شکل و صورت کے ساتھ خدا نے ایک عیب بھی دیا تھا یعنی چور اول نمبر کے تھے۔

حضرت خاقان زمان محمد امجد علیشاہ بہادر کا زمانہ ہے۔ امین الدولہ امداد حسین خاں صاحب بہادر ذوالفقار جنگ خلعت ہاتھی اور پالکی سے سرفراز ہو کر مسند وزارت پر جلوہ گر ہیں میرزا رضا علی بیگ کوتوال شہر رومی دروازہ پر کوتوالی کر رہے ہیں، میر غلام عباس کی سفاکیوں کا شہر میں شہرہ ہے مہاجن اپنی دولت کی حفاظت میں کوشش بلیغ کر رہے ہیں لیکن میر صاحب کی کارروائیوں کا سکہ ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ لوگ خدمت میں دریغ نہیں کرتے جس رئیس سے جتنی رقم طلب کیجاتی ہے گھر بیٹھے چلی آتی ہے اسی چوری کے مال سے میر صاحب جس دن کو وہ بھی نکالتے ہیں غریب غربا کے ساتھ سلوک ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی جگہ دھرے گئے اور بعد تحقیق جرم ثابت ہوا عدالت سے سال بھر کی سزا ہوئی مہینہ بھر تک دوران مقدمہ میں بندھوا خانے میں گھر سے کھانا جاتا تھا جس دن سے سزا کا حکم سنایا گیا تھا سینچنے والے اصطبل میں قید ہوئے تو بھی گھر سے کھانا افیون تمباکو روزانہ پہونچتا تھا کیونکہ شاہی جیل میں بھی کوئی تکلیف گھبرانے کے سوا نہ تھی غذا تو اچھی ملتی تھی باقی سب طرح کا آرام تھا کوئی مشقت نہیں لی جاتی تھی۔

دوست احباب دیکھ سکتے تھے عزیز و اقارب مل سکتے تھے اگر تکلیف تھی تو یہ تھی کہ قیدی گھر نہیں آ سکتا تھا بعینہ یہی حالت تھی جیسے آجکل انگریزی جیلخانوں میں انگریز قیدی۔ اسپر بھی میر صاحب کو زندگی حرام تھی یار باش اور زندہ دل آدمی انکے لیے تو اتنی قید بھی دوزخ سے کم نہ تھی۔

محرم سے دو مہینے قبل بادشاہ کی خدمت میں عرضی پیش کی کہ فدوی گردش فلک سے چوری کے الزام میں ناحق گرفتار ہو کر مبتلائے مصیبت ہے شیعہ مذہب ہے اور محرم کا زمانہ قریب ہے اور میں ماتم دار حسین ہوں ہر سال تعزیہ رکھتا ہوں اگر اس زمانہ میں بھی زندان مصیبت سے رہا نہ ہوا تو بروز قیامت دربار حسین میں فریاد کروں گا واسطہ خون حسینؑ کا مجھے تعزیہ داری کی اجازت دی جائے بعد ایام چہلم حاضر ہو کر سزا کی مدت پوری کر دوں گا۔

یہ عرضی منصف الدولہ سید باقر صاحب مہتمم عدالت فوجداری کے حضور میں پیش ہوئی اور حکم ہوا کہ ملزم بری کیا جائے۔

میر غلام عباس رہا ہو کر خوشی خوشی گھر پر آئے بٹیر بازی ہونے لگی یاروں میں افیون چلنے لگی محرم میں عزاداران حسین میں شامل ہوئے سیاہ کپڑے پہنے گلے میں ناڑا ڈالا خوب خوب مجلسیں کیں ہر جگہ شریک بزم عزا ہوئے اور بعد اربعین منصف الدولہ بہادر کے اجلاس پر حاضر ہو گئے کہ بقیہ سزا بھگت آؤں، عدالت نے از راہ ترحم سزا معاف کر دی اور ہدایت کی کہ تم شریف آدمی ہو ایسی حرکت نہ آئندہ سرزد ہو۔

ایک دن ڈپٹی نواب معین الدولہ صاحب نے ایک گوہر نایاب دکھایا جسکی چمک سے میر صاحب کی آنکھوں میں خیرگی آ گئی اور ارشاد کیا کہ میرے پاس اسکی ایک ہی فرد ہے یا تو کہیں سے مجھے ایسا موتی بہم پہونچا دو یا اسے تم چرا لیجاؤ میں نے تم کو بحل کیا میر صاحب نے کئی روز کا وقفہ دے کر رات کو پشت دولت سرا سے کمند ڈالی کوٹھی میں داخل ہوئے دیکھا تو نواب صحن خانہ میں مسہری پر آرام کر رہے ہیں آپ نے آہستہ آہستہ پنکھا جھلا نواب صاحب نے کروٹ بدلی کنجی کا گچھا ازار بند میں بندھا ہوا تھا اسے کھولا تو معلوم ہوا ازار بند میں ایک دوسری گرہ بھی دی ہوئی ہے اسے بھی کھولا تو وہی موتی نکلا میر صاحب نے کنجی کا گچھا تو باندھ دیا اور موتی لے کر چلتے ہوئے، دوسرے دن نواب کی ملاقات کو آئے تو وہی موتی پیش کیا اور کہا غلام نے آپ کی فرمائش پوری کر دی نواب نے دیکھا تو حقیقت میں موتی ویسا ہی تھا بہت پسند کیا اور کہا بھئی اسکی قیمت کیا لو گے میر صاحب نے کہا پہلے آپ اپنا موتی محل سے لائیں اور دونوں ملا کر دیکھیں۔

نواب نے خیال کیا کہ موتی تو میرے پاس ہے مگر ان کے سامنے ازار بند سے نکالنا رکیک بات ہے اسلئے محل میں گئے اور وہاں دیکھا تو ازار بند خالی ہے مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے اور کہنے لگے۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

پھر نواب صاحب نے کہا میں تو نہ مانوں گا کوئی ہمزاد تمہارے قبضے میں ہے ورنہ موتی کا غائب ہونا خلاف قیاس ہے۔

میر صاحب نے اول سے آخر تک تمام قصہ بیان کیا سُن کر متعجب ہوئے اور کہنے لگے تو یہ موتی آپ کی محنت کا صلہ ہے آپ ہی اسے قبول کریں یا مجھ سے اسکی قیمت لے لیں، میر صاحب نے کہا میں نے آج تک کسی دوست کے مال پر نظر نہیں ڈالی میرے محلے کے لوگ گھر کا دروازہ بند کر کے نہیں سوتے اور ان کا تنکا بھی نہیں جاتا مجھپر تو آپ کا مال حرام ہے۔

میر صاحب حیدری طوائف کے عاشقوں میں تھے صورت شکل تو کچھ اچھی نہ تھی سانولا رنگ چیچک کے داغ کثرت سے گھرے گھرے تھے کہ الاماں۔ مگر گلا نور کا پایا تھا امیر مرزا ایک بانکے تھے وہ بھی اسپر مرتے تھے۔ مگر میر صاحب کی آشنائی سابق سے تھی اور حیدری میر صاحب سے محبت کرتی تھی اس کا وسیع امامباڑہ ان ہی کی دولت سے تعمیر ہوا۔

ایک دن حیدری نے فرمائش کی کہ میر صاحب تمہاری بدولت بہت چین کیا دولت ثروت جو کچھ میرے پاس ہے سب تمہاری دی ہوئی ہے مگر میں نے آج کرم بخش طوائف کے ہاتھ میں ہیرے کے جڑاؤ کڑے شیر دہاں دیکھے تو دل لوٹ گیا۔ جہاں سے تب مجھے بھی ویسے ہی

کپڑے بنوا دو میر صاحب نے کہا اچھا مجھے وہ کپڑے دکھا دو اس نے کرم بخش سے منگوا دیے۔ آپ نے غور سے دیکھا اور کہا بس یہی دیکھنا تھا مجھے معلوم ہو گیا جس سنار نے اسے بنایا ہے ممکن ہوا تو اس سے بہتر تم کو بنوا دوں گا۔

اپنے شاگردوں سے بھی کہہ دیا کہ اسطرح کے کپڑے کی جوڑی کہیں دیکھنا تو ہمیں اطلاع دینا۔

خبر ملی کہ بی مغلانی قادر بخش کی ماں کے پاس ایک جوڑی کپڑے کی نہایت نفیس قدسیہ محل کی دی ہوئی موجود ہے اور وہ آجکل پٹنے سے لکھنؤ میں آئی ہوئی ہیں اور گولہ گنج کے قریب کسی کوٹھی میں رہتی ہیں۔

مکان کا نقشہ دیکھا پوچھتے پوچھتے یہ پتا بھی مل گیا کہ بی مغلانی کے پاس جو جواہرات زیورات کی قسم سے نواب قدسیہ محل کا دیا ہوا تھوڑا بہت جو صرف سے باقی رہ گیا ہے وہ سب لوہے کی الماری میں مقفل ہے اور الماری کے پاس مغلانی کی مسہری لگی ہوئی ہے اور وہاں رات کو کھٹولا سی بیٹھی رہتی ہیں صرف دو تین مرتبہ تو چوکی پر جاتی ہیں نماز کیلئے مسہری کے قریب چوکا لگا ہوا ہے اس پر سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے اور جا نماز رکھی ہوئی ہے آس پاس پیش خدمتیں ماما ئیں اپنے اپنے دالانوں میں رہتی ہیں قریب ہی باورچیخانہ ہے آدھی رات تک تو کھانے سے فرصت ہوتی ہے۔

میر صاحب سب پوچھ چکے تو ایک دن اندھیری رات میں مکان کی چھت پر باہر سے چڑھے اور زینہ سے آہستہ آہستہ اترے تو بی مغلانی کے کھنکارنے کی آواز آئی یہ سمجھ گئے کہ میرے پاؤں کی چاپ سے کچھ شک گزرا چپکے کھڑے ہو کر جھانک کر دیکھا تو بی مغلانی بیٹھی ہوئی ہیں اسوقت گھڑی میں تو دو بجے تھے اب میر صاحب اس خیال میں ہیں کہ آنکھ لگے تو زینے سے اتر کر مکان میں جاؤں۔

مگر وہ خدا کی بندی اسیطرح بیٹھی رہی ابھی بہت اندھیرا تھا کہ ماما سے لالٹین جلوا کر چوکی پر گئیں اتنی دیر میں میر صاحب مکان میں جا کے کمرے میں گئے اور مسہری کے پاس الماری کے قریب پہونچے دیکھا تو ماما مع لالٹین واپس آ رہی ہے۔ اور بی مغلانی اب فریضہ صبح کے انتظام میں ہیں یہ تو جھٹ الماری کے نیچے لیٹ رہے اور بیچارے بھوکے پیاسے دن بھر لیٹے رہے سانس نہ لی رات کو بی مغلانی چوکی پر گئیں اور لوگ کھانا پکانے میں مصروف تھے کہ انھوں نے آہستہ سے لات ماری تو الماری کا قفل کھٹ سے گر پڑا آپ نے جواہرات کا صندوقچہ اپنے پاس رکھ لیا اور تین بجے رات کو چوکیدار ابھی خواب ناز میں تھے زینے سے کوٹھے پر اور کوٹھے سے گلی میں جا کر بی حیدری کے امام باڑے میں پہونچے اور کہا ذرا ان چیزوں کو حفاظت سے رکھنا۔

صبح کو شہر میں ایک عام شہرت تھی کہ بی مغلانی کے گھر میں جھاڑو پھر گئی ایک تنکا بھی نہ بچا۔

عدالت میں عرضی دی گئی کوتوال کو تحقیقات کا حکم ملا لیکن کچھ سراغ نہ لگا۔

کئی مہینے کے بعد عیش باغ میں ساون کے میلے ہو رہے تھے اور ساون کے آخری جمعہ میں بڑی دھوم دھام سے تمام شہر کی رنڈیاں خیمے ڈیرے ڈالے پڑی تھیں۔

بی حیدری بھی ایک خیمہ کے نیچے فروکش ہیں جو نہایت نفیس قالینوں سے آراستہ ہے کرسیاں مونڈھے سے لگے ہیں خدمتگار نئی وردیاں زیب جسم کیے کھڑے ہیں انکے ہاتھ میں ہیرے کے کڑوں کی شیر دہاں جوڑی ایسی زینت دے رہی ہے کہ دیکھنے والے ششدر رہ جاتے ہیں رفتہ رفتہ

کسی مخبر نے یہ خبر مرزا رضا علی بیگ کوتوال کو پہونچائی وہ بھیلانکے خیمے میں آئے کپڑوں کو غور سے دیر تک دیکھتے رہے اتنے میں میر صاحب بھی آ گئے۔

کوتوال نے پہلے تو حیدر جان سے کہا ماشاء اللہ آج تو آپکا زیور سب نڈیوں سے سبقت لیگیا سبحان اللہ مگر یہ کپڑے کی جوتی تو سارے لکھنؤ میں غریب ہے ذرا تکلیف نہو اُتار کر مجھے دکھا دیجیے۔ اس نے ایک پیر کا اُتار دیا۔ کہنے لگے دوسرے ہاتھ کا بھی اُتار دیجیے تو دونوں ملا کر دیکھیں پھر کہنے لگے یہ کب آپنے بنوائے اس نے کہا صاحب ہم کو بنوانے کی کیا ضرورت ہے اللہ رکھے میر صاحب کو جنکے دم سے ہم نے بہت کچھ پہن کیا یہ بھی انھیں کا عطیہ ہے۔

میر صاحب دل میں کہنے لگے یہ کیسی بیوقوف عورت ہے اول تو کوتوال کے آتے ہی اسے کپڑے چھپا دینا تھے اور نہ چھپائے تھے تو میرا نام لینا کیا ضرور تھا۔

یہ کلمہ سن کر کوتوال صاحب میر صاحب کی طرف مخاطب ہوئے کیوں جناب میر صاحب قبلہ آپنے اس زیور کو کہاں بنوایا۔

میر صاحب نے حواس بجا کر کے جواب دیا ہم کو زیور بنوانے کی کیا حاجت ہے لکھنؤ آباد رہے ہمارے دم کے واسطے کیا کمی ہے اچھے سے اچھا کھاتے ہیں اچھے سے اچھا پہنتے ہیں مزے کرتے ہیں۔ کوتوال صاحب نے کہا اچھا اسکا مزا آپ کو چکھایا جائیگا میر صاحب نے کہا بہتر۔

کوتوال کے ساتھ جو پولیس باہر کھڑی تھی اسے حکم دیا کہ میر صاحب کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈال دو ہتھکڑی کا نام سن کر میر صاحب کے تیور میلے ہوئے۔ جب پولیس والے ہتھکڑیاں پہنا چکے تو میر صاحب نے کوتوال سے کہا کہ رضا علی کیا تم اپنے دل میں سمجھے ہو کہ میں ایک شریف سید کو بے عزتی سے گرفتار کر کے لیجا سکتا ہوں۔ یہ کہکر دونوں ہاتھوں کو ایسا جھٹکا دیا کہ ہاتھ تو ہتھکڑیوں سے باہر نکل آئے اور پیچھے ہٹکر کہا اچھا تم اتنے جوان ہو اور سب کی کمر میں تلوار ہے اگر مجکو گھیر کر پکڑ لو تو غلامی کا خط لکھے دیتا ہوں۔ مرزا رضا علی بیگ تو جانتے تھے کہ میر صاحب کے مقابلہ کا آج کوئی جوان شاطر نہیں ہے اسلیے خوشامد کرنے لگے میر صاحب غلطی سے آپ کی خدمت میں گستاخی ہوئی معاف کیجیے گا یہ پولیس والوں کی تھی آپکے حفظ مراتب کا اسکو کیا خیال ہوتا۔ آپ میرے دوست ہیں میں سرکاری حکم سے مجبور ہو کر آپکے پاس آیا ورنہ ایسا خیال بھی نہوتا۔ اگر آپ کو ہماری بدنامی منظور ہے تو بسم اللہ آپ کا جہاں جی چاہے چلے جائیے اور اگر کچھ پاس ملاقات ہے تو عدالت تک تشریف لے چلیے ہم کوشش کر کے اپنے عہدے سے بری الذمہ ہو جائیں گے اسوقت آپ کو اختیار ہے۔ میر صاحب نے کہا اچھا چلیے ہم کو آپ کی آبرو کا پاس اپنی جان سے زیادہ ہے۔

میر غلام عباس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور بعد ثبوت جرم کچہری سے گُل لگانے کا حکم نافذ ہوا۔

میر زا رضا علی بیگ نے حکم پاتے ہی اسکی تعمیل کو لازم سمجھا کیونکہ وہ بھی میر صاحب سے جلے ہوئے تھے اور عہد شاہی میں اس قسم کی سزا بہت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ جب تک میر صاحب کی سفارش کو اکابرین شہر کچہری تک آئیں آئیں مرزا رضا علی بیگ کوتوال نے دو لوہے کے گول چھلے جن کا دور پیسے کے برابر تھا آگ میں لال کر کے میر صاحب کی دونوں کنپٹیوں پر لگا دیے۔ اس دن سے میر غلام عباس گلیا ز مشہور ہو گئے!

کچھ زمانہ بعد غدر ہو گیا لوگ چار مہینہ تک خانہ بدوش رہے بہت سے بے قصور بھوچوں کے ہاتھ سے مارے گئے بہت سے فقرا کے گھر لٹے۔ تمام دولتمند ذی عزت دانے دانے کو محتاج ہو گئے باغیوں کے شبہ میں بہت سے ناکردہ گناہ تہ تیغ ہوئے۔ بعد تسلط کے ہزاروں نوجوان بڈھے باپ کے سامنے عیش باغ کی بارہ دری میں سولی پر لٹکائے گئے۔ اور گورنمنٹ نے قبضہ کر کے تمام شہر میں کچہریاں قائم کیں جیل خانہ بنوائے اور انکو خطرناک سزائیں ملنے لگیں رام باس کوٹتے کوٹتے ہاتوں میں چھالے پڑ گئے چکی پیسے پیسے دم ناک میں آ گیا۔ سخت محنت لی جانے لگی۔ بید پڑنے لگے۔ یہ سب حال میر صاحب نے سُنا تو چوری سے توبہ کر لی۔ اور نیا قانون ایجاد کیا بعض لوگوں نے ہنسی سے کہا کہ حضرت آپ نے اپنا پیشہ اب کیوں چھوڑ دیا۔ کہنے لگے بھائی وہ زمانہ اور تھا۔ ہم قوم بادشاہ تھا ہم قوم حاکم تھے۔ یہ انگریز سات سمندر پار سے آئے ہیں ان کو ہمارا کیا درد ہوگا انکی بلا سے مرو دوزخ میں جائے یا بہشت میں انھیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے یہ تو دشمنوں کی طرح سزا دیتے ہیں ہمارے جینے اور مرنے کا افسوس نہیں۔ ان کے وقت میں ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا چاہیے۔

چوروں کے مختلف اقسام ہیں۔

ٹھگ۔ یہ لوگ ایک قوم ہیں دیہات میں رہتے ہیں۔ مسافروں کو دھوکا دیکر جنگل کی طرف لے جاتے ہیں اور انکو زہر کھلا کر یا پھانسی دے کر مار ڈالتے ہیں۔

چور۔ یہ لوگ مختلف قوم کے ہیں۔ رات کو نقب لگاتے ہیں یا کمند پھینک کر چوری کرتے ہیں کسی کی جان نہیں لیتے ہیں۔

ڈاکو۔ یہ ایک جماعت ہے جو دن دہاڑے گھر میں گھس کر مالک مکان کو ہلاک کرتے ہیں اور اسکا اسباب لوٹ لیجاتے ہیں۔

لٹیرے۔ یہ بھی دن کو آنکھوں کے سامنے سے چیز لے کر بھاگتے ہیں۔

گرہ کٹ۔ یہ راہ گیروں کی گرہ کاٹ لیتے ہیں۔

اوچکے۔ یہ ہاتھ سے چیز چھین کر لے بھاگتے ہیں۔

غرضکہ چوری کی سزا تو اتنی سخت ہے کہ میں اسکی برداشت نہیں کر سکتا میں نے توبہ کر لی ہے لیکن قانون کی رو سے میں نے ایسے ضابطہ مقرر کیے ہیں جو اس الزام میں نہیں آ سکتے۔

اب شاہی کے بعد میر غلام عباس نے رستی بٹوں کے محلہ میں قیام کیا۔ وہاں تمام محلہ چوری سے محفوظ رہنے لگا۔ انکے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ وہی کچھ خدمت کرتے تھے۔

گنگا نامی ایک شاگرد تھا اس نے آپ کو ایک نفیس ڈول دیا پوچھا بھائی یہ تم کہاں سے لائے اس نے کہا اُستاد بارہ سے دس بارہ چوبردے اور چھکڑے گیہوں کے جا رہے تھے۔ ان کے بیچ میں ایک چھکڑے کے پیچھے ڈول رستی لٹکی ہوئی تھی ہم کو آپکی فرمائش کا خیال آ گیا دو آدمی ہمارے ساتھ اور بھی تھے اُنھوں نے دھوتی ندی میں چھانٹی اور گیلی گیلی لے کر سر پر آ گئے ہم نے کہا

اس دھوتی کو کھول کر سُکھانے کے بہانے سے اس جھکڑے کے پیچھے لگا دو جب اُنھوں نے آڑ کر لی تو ہم نے ڈول رسّی اُتار کر کچھ اناج بھر لیا یہ وہی ڈول ہے۔

ایک دن معلوم ہوا کہ ایک مہاجن بہت سود کھاتا ہے اور بہت مالدار ہے میر صاحب نے ایک صندوقچہ زیور جواہرات کا اپنے پاس سے نکالا اور اسی وضع اور قطع کا ایک دوسرا صندوقچہ بنوایا اسپر زر بفت کا غلاف چڑھایا۔

پانچ چھ آدمیوں کو وردیاں نئی پہنائیں اور ایک فنس مع چھٹکے کے منگوائی نو بجے رات کو کہار بلوا کر اس فنس میں دونوں صندوقچے رکھ دیے اور فنس کے ساتھ چند سپاہی کر دیے اور ایک آدمی کو داروغہ صاحب بنا کر ہمراہ کیا۔

داروغہ صاحب بہت شان و شوکت سے مہاجن کے مکان پر آئے اور بیان کیا کہ کھنڈت پور کی رانی صاحبہ تشریف لائی ہیں جو ڈسٹرکٹ میں مقدمہ ریاست کی کل ایک بیٹی ہے یہ ٹھاکر بلبدر سنگھ کی بیوہ ہیں۔

کچھ روپیہ سردست ضلع والوں کو دینے کی ضرورت ہے اور نہ دیا جائے تو مقدمہ خراب ہوا جاتا ہے۔ یہاں روپیہ بقدر نہیں ہے علاقہ سیتاپور میں ہے سردست پانچہزار روپیہ چاہیے ہے اگر تم نے رانی صاحبہ کا نام سُنا ہو اور ان کو جانتے ہو تو اسوقت روپیہ دیدو جو سود لگاؤ گے ادا کیا جائیگا اور پرسوں سب روپیہ تمھارا گاؤں سے منگوا دیا جائیگا اسمیں بھی عذر ہو تو رانی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میرے پاس جو زیور چالیس ہزار کی مالیت کا ہے اسے اپنے پاس رکھ لو۔

مہاجن نے کہا بھلا اسوقت روپیہ کی تدبیر کیا ہو سکتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ زیور کا رکھنا جانچنا بھی تو مشکل ہے سویرے معاملہ طے ہو سکتا ہے داروغہ صاحب نے کہا بات یہ ہے کہ اتنی جلدی اور سخت ضرورت نہ ہوتی تو ہم بغیر سود ہر جگہ سے چالیس پچاس ہزار تمھاری دعا سے مانگ لا سکتے۔ نواب شیش محل سے بھی لین دین ہے مگر گھوس کا معاملہ جو ڈسٹرکٹ کمشنر کا عملہ فریق ثانی کی کوشش پر تو اسوقت بازی پھر سکتا ہے جب ہم رات ہی کو مٹھی گرم کر دیں ورنہ دوسرا فریق کامیاب ہو جائیگا کیونکہ اسوقت تو قرض نہیں ہو سکتی دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا مال تو چالیس ہزار روپیہ کا ہے زیور میں کہاں تک دغا اور کھوٹ ہوگی پرکھ لو اندازہ کر لو تمھاری نگاہ میں جنچے تو روپیہ دیدو ورنہ کسی دوسری جگہ سے کوشش کی جائے کیونکہ ہمیں دیر لگانے کا وقت نہیں ہے یہ بات اور ہے کہ تم کچھ سود زیادہ کر لو کیونکہ ہمیں تو صرف ایک ہی مہینہ کا سود دینا ہوگا اور روپیہ بھی میعاد کے اندر ادا کر دینا ہے۔

لالہ پہلے تم زیور دیکھ لو۔ داروغہ نے فنس کے پاس جا کر کہا حضور ذرا صندوقچہ دیدیجیے۔ صندوقچہ لے کر مہاجن کے پاس رکھدیا اس نے دیکھا زربفت کے غلاف میں چاندی کا صندوقچہ ہے۔

زیور کو اچھی طرح جانچا سونے کی چیزوں کو کسوٹی پر رگڑا جب اپنا اطمینان کر لیا تو کہا اچھا اسوقت ہزار روپیہ کا بندوبست ہو سکتا ہے اور دو روپیہ سیکڑا سود لیا جائیگا۔ داروغہ نے کہا سود تو بہت کہتے ہو لیکن ہمیں ضرورت ہے اسکی کوئی بات چیت نہیں ضرورت کے وقت ایسا ہوتا ہے مگر روپیہ تم کو پورا ۵ ہزار دینا ہوگا۔

زیور دیکھا مہاجن کے منھ میں پانی بھر آیا کہ کسی طرح پچاس ہزار روپیہ سے کم کا مال نہیں ہے رکھیا تو کچھ دے جائے گا۔

اسیوقت مال کی ایک فہرست بنائی وزن لکھا گیا نوعیت لکھی گئی اور ہر چیز پر ایک ایک چھٹی لگا کر صندوقچہ مہاجن نے سب کے سامنے مقفل کیا اور کنجی داروغہ صاحب کو دیدی۔

داروغہ صاحب نے کہا ذرا سا گوند دو تو رانی صاحبہ اپنے نام کی مہر قفل پر چسپاں کر دیں تاکہ شک باقی نہ رہے۔

مہاجن نے اسکو پسند کیا صندوقچہ فنیس میں گیا اور بہت جلدی قفل پر مہری کاغذ چپکا ہوا واپس آیا۔

پانچ ہزار کے نوٹ مہاجن نے دیدیے یہ لوگ روپیہ لے کر چمپت ہو گئے، مہینہ بھر تک تو مہاجن نے صبر کیا لوگوں سے دریافت کیا لکھنؤ پور کا پتہ نہ لگا اور معلوم ہوا کہ کسی بیوہ رانی کا مقدمہ بھی نہیں اسوقت اسے بہت افسوس ہوا لیکن دل مضبوط تھا آخر صندوقچہ جی کڑا کر کے کھولا اسمیں اینٹیں بھری ہوئی تھیں بیچارہ باوجودیکہ دولت کثیر رکھتا تھا۔ مگر اس صدمہ سے جانبر نہو سکا۔

میر غلام عباس نے شارع عام پر ایک کمرہ بنوالیا اور اسمیں دو چار ٹیر باز دو چار افیونی بیٹھے ہوئے ہیں حقہ چل رہا ہے گنے چھل رہے ہیں تمام محلہ انھیں کی اردلی میں رہتا ہے۔

دس گاڑیاں گیہوں کی جارہی ہیں دو شریف آدمیوں نے آواز دی اور کہا اگر تم چاہتے ہو تو یہیں سودا میر صاحب کے ہاتھ کرلو۔

گاڑیوں میں ایک مکھیا ہوتا ہے اس نے کہا اچھا۔ گیہوں کا نرخ طے ہوا اور مال تُلنے لگا۔ محلے کے لوگ دو دو چار چار روپیہ کا اناج خرید رہے ہیں اور جو کوئی دس روپیہ کا لیتا ہے پانچ روپیہ میر صاحب کو دے جاتا ہے اور کہہ جاتا ہے باقی پھر دیدیا جائیگا وہ سب روپیہ اپنے پاس جمع کرتے جاتے ہیں چار روپیہ کا اناج اپنے گھر میں بھجوا دیتے ہیں جو سپاہی پہرے پر ہوتا ہے اسے بھی دو روپیہ کا اناج مل جاتا ہے اس صورت سے سب اناج بک جاتا ہے اور جو کچھ روپیہ جمع ہوتا ہے میر صاحب اسمیں سے دس روپیہ نکال کر باقی روپیہ مکھیا کے ہاتھ میں رکھتے ہیں وہ کہتا ہے باقی روپیہ تو دیجیے کہتے ہیں کہ باقی روپیہ بھی دو مہینہ بعد آکر لیجانا کیا ہم مکرتے ہیں اپنا حساب کرلو ہم سے لکھوا لو

وہ لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے محلہ والے تو سب انکے شریک ہوتے ہیں کیا ہندو کیا مسلمان سب انھیں کی طرف سے بولنے لگتے ہیں آخر کاغذ لکھوا کر چلا جاتا ہے دو مہینہ کے بعد پھر آتا ہے۔

میر صاحب فرماتے ہیں بھئی روپیہ کا ابھی بندوبست نہیں ہوا ہے ذرا صبر کرو آجکل ربیع پکنے والا ہے آخر وہ مجبور ہو کر دیوانی میں نالش کرتا ہے انکی تحریر پیش کرتا ہے۔ میر غلام عباس فوراً اقرار کرلیتے ہیں کہ بیشک سکا روپیہ واجب الادا ہے اور یہ تحریر بھی میرے ہاتھ کی ہے اور اس کا تمام حساب صحیح ہے سرکار اسے ڈگری دیدیتی ہے۔

اجراے ڈگری کراتا ہے تو مکان میں ٹوٹی چارپائی بھی نہیں ملتی مجبور ہو کر انکی ذات پر قرقی لاتا ہے اور میر صاحب گرفتار ہو جاتے ہیں اس صورت میں نالش کرنے والے کو سات روپیہ ماہوار قیدی کی خوراک دینا پڑتے تھے اور میر صاحب بیٹھے بیٹھے آرام سے کھاتے تھے

اور جس مہینے میں خوراک کا روپیہ جمع نہوا یہ چھوٹ کر گھر چلے آئے پھر وہی مشاغل شاہی بڑے بڑے کھاتے کھلے ہیں لوگ حساب جانچ رہے ہیں حقہ بھرا ہوا ہے یار لوگ غپیں اُڑا رہے ہیں کوئی شامت کا مارا دیہاتی مل گیا لوگ گھیر گھار کر اسے لائے خود بھی مال کھایا محلے والوں کو کھلایا اور قرضہ کا سرخط لکھ دیا ماہوار ادا کرنے کی رقم طے ہوگئی ایاں دار سر پیٹا کرے روپیہ کہاں جولے شہر والے تو سب جانتے تھے بہت کم پھنستے تھے دیہات والے غریب ہمیشہ شکار ہوا کرتے تھے آخر کو ان ذات شریف سے منصف صاحب بھی واقف ہوگئے تھے جب کسی کی عرضی انکی بابت گزری اور مدعی مدعا علیہ دونوں پیش ہوئے منصف صاحب نے صورت دیکھتے ہی مدعی سے کہدیا تم بھی کہاں پھنسے یہ پرانا ڈاکو میر غلام عباس گلباز ہے تم نے اسکا نام سُنا ہوگا اس کے پاس کیا ہے جو تم لوگے سیکڑوں قرقیاں جا چکی ہیں ایک پیسہ بھی نہیں وصول ہوا وہ بیچارہ نام سنتے ہی مقدمہ سے دستبردار ہو جاتا تھا۔

ایک دن قضا کا مارا ایک چڑی مار آیا میر صاحب کو اس پیشہ کے نام سے نفرت تھی آپنے ایک ایک پیسہ کی چڑیاں خریدیں اور سب محلہ والوں پر سے صدقہ کر کے چھڑوا دیں جب بھیٹکی خالی ہوگئی تو آپنے دو آنہ پیسے چڑیمار کو دیے اُس نے کہا خداوند یہ کیا دیتے ہیں ایک روپیہ چھ آنہ کا مال چھوڑا ہے کہنے لگے نہیں یہ دام نہیں دیے بلکہ تم کو کھانے کو آج یہ دو آنے دیے ہیں کل آکر حساب کر لینا وہ چلا گیا دوسرے دن سویرے تقاضے کو آیا تو کسی محلے والے نے کہدیا ارے کس سے مانگتا ہے جانتا نہیں کہ میر غلام عباس گلباز ہیں کیا آج بھی کچھ شامتوں نے گھیرا ہے وہ نام سنتے ہی رفو چکر ہو گیا لاکھ لاکھ لوگ پکارتے رہے ایک جواب نہ دیا۔

نوبت یہانتک پہونچ گئی کہ اس راستہ سے سودے والوں نے راستہ چلنا چھوڑ دیا اور گاؤں گاؤں یہی مشہور ہو گیا کہ شہر میں ایک گلباز ہے جو لوگوں کو لوٹ لیتا ہے جب یہ بازار بھی ٹھنڈا پڑ گیا تو میر صاحب کی طباعی نے ایک اور جدت کی خوش پوشاک تو ہمیشہ سے تھے اور صورت شکل سے شریف معلوم ہوتے تھے کلن خاں حکاک سے جو شیشے کو الماس بنا دیتے تھے کچھ نگینے خریدے اور سونے کی انگوٹھیوں پر انھیں جڑوا کر آپ خود رئیس بن کر دو چار خدمتگار ساتھ لے کر کلکتے بمبئی میں جاکر مہاجنوں کے ہاتھ فروخت کر کے لکھنؤ چلے آتے اور آرام سے زندگی بسر کرتے۔

پولیس کو اکثر انکی ذات پر شک ہوا کہ چوری ضرور کرتے ہیں ورنہ ایسا شاہانہ خرچ کہاں سے چلتا؟ مگر کوئی موقعہ انھیں گرفتار کرنے کا نہیں ملا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے کسی شاگرد نے لمبی چوری کی تھی اور اس نے حسن عقیدت سے اسمیں سے کچھ اسباب اُستاد کی نذر کیا پولیس کو اس امر کی خبر مل گئی وہ تو انکی دشمن تھی فوراً کوتوال صاحب دوڑ لے کر آ پہونچے اس زمانہ میں میر صاحب محلہ اصطبل میں محمد علیخاں بٹّے وار کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے جیسے ہی آپ کو معلوم ہوا کنوئیں میں اُتر کر اسباب کسی گوشہ میں رکھ آئے اور آپ مکان کی چھت سے لپٹے پڑے رہے پولیس نے پوچھا معلوم ہوا کہ میر صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں ان کے اسباب میں کوئی چیز مال

مسروقہ سے نہ ملی پولیس ناکام واپس آ گئی۔ قانونی تو آپ نے میر صاحب کی سُن لی اب عقلی ترمیم سُنیے۔

ایک میم صاحب خوش پوشاک حسین اور ان کے صاحب بہادر امین آباد کی سڑک پر جا رہے ہیں کوئی حاکم معلوم ہوتے ہیں میم صاحب سونے کی بیش قیمت گھڑی لگائے ہیں ایک دس برس کا لڑکا روتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے میم صاحب مارے ڈالتا ہے ایک آدمی اسکے پیچھے دوڑا آتا ہے لڑکا میم صاحب کے قدموں پہ گرتا ہے اور کہتا ہے مجھے بچا لیجیے میم صاحب اُسے اُٹھاتی ہیں وہ میم صاحب سے لپٹ کر کہتا ہے مجھے بچائیے۔ مارنے والا تو انگریز کی شکل دیکھ کر ہٹ جاتا ہے اور لڑکا میم صاحب کی گھڑی نکال کر چلتا ہوتا ہے اور میم صاحب کو خبر نہیں ہو تی۔

دوسری ترمیم۔ نخاس میں ایک مسلمان غریب آدمی لوہے کا پنجرہ طوطے کے واسطے چکاتا ہے اور بہت سمجھ بوجھ کے چھ آنے کا پنجرہ مول لیتا ہے کمر سے ہمیانی کھول کر اس میں سے ایک روپیہ نکال کر دوکاندار کو دیتا ہے پیسے واپس لے کر چوک کی طرف رُخ کرتا ہے کہ کچھ ضرورت کی چیزیں اور مول لے لے ہمیانی کھولتے وقت گنگا نے بھانپ لیا سو یا سو اسو روپیہ اسکے پاس ہے جس گلی میں یہ مسلمان ضعیف مڑتا ہے اسی گلی سے ایک ہندو دھری بھی اسکے آگے آگے جاتی ہے اور اس سے غفلت میں ایک خوبصورت بٹوا گر پڑتا ہے مسلمان بڈھے کے پاس ہی سے ایک دوسرا آدمی نکل کر اس بٹوے کو اُٹھا لیتا ہے اور مسلمان کو ہاتھ جوڑ کر اشارے سے ایک دوسری گلی میں لیجاتا ہے اور کہتا ہے بھائی تم نے تو دیکھا ہی تھا اس دھری نے یہ بٹوا پھینکا ہے اور ہم نے اُٹھا لیا اور یہ خیال کیا کہ مل بانٹ کر کھائینگے تو ہضم ہو جائیگا دیکھو تو اسمیں کیا ہے کھول کر دیکھا تو ایک سونے کے کڑے کی جوڑی اور ایک جوڑی بجلیوں کی ہے آدمی نے کہا سچ بات تو یہ ہے کہ اس بازار میں چل کر انکو بیچیں جتنے کو بکے آدھے دام ہم لے لیں آدھے تم۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں وہی عورت دُہائی دینے لگی ہے ہے میں لُٹ گئی۔ میرا بٹوا یہاں گر گیا جسنے پایا ہو مجھ سے دس پانچ روپیہ لے لے میرا تین سو کا مال تھا یہ لوگ اسکے غل مچانے کے خوف سے ایک دوسری گلی میں چھپکر بیٹھ رہے اب یہاں بڈھے کو لالچ نے گھیرا کہنے لگے یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے جو قیمت آنکو ہم دیدیں یا تم دیدو اور لے لو اس نے کہا چھاڈیڑھ سو کا مال رکھیے پچھتر روپیے ہم سے لے لیجیے۔

کہنے لگے واہ تین سو کا مال اور پچھتر روپیے اتم ہم سے سو روپیہ لے لو آخر دو کد کے بعد اس نے روپیہ لے لیا اور چل دیا چلتے چلتے بڑے میاں کو شک گزرا ایسا نہو مال کم ہو ذرا انکو الینا چاہیے جہاں جن کو دکھایا اس نے کہا پیتل پر سونے کا ملمع کیا ہوا ہے یہ تو کوئی چیز نہیں کلیجہ پکڑ کر رہ گئے پولیس میں رپورٹ لکھوائی دن بھر پریشان رہے کچھ حاصل نہوا یہ بھی میر صاحب کی ایجاد تھی میر صاحب نے اسکا نام ٹپکا رکھا تھا۔

تیسری ترمیم یہ تھی کہ تین آدمی ہیں ایک آدمی گنجفہ کے تین پتے لیے ہے اور اسی ہاتھ سے اُلٹے رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ بتاؤ کون پتہ ہے اور جو کچھ لگانا ہے لگاؤ ایک آدمی ایک روپیہ لگاتا ہے کہ یہ بادشاہ ہے وہ جیت جاتا ہے اسی لالچ سے دوسرا آدمی جا رہا ہے اور ایک راہگیر سے کہتا ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے وہ ایک روپیہ لگاتا ہے اور ہار جاتا ہے دوسرا اور تیسرا روپیہ لگاتا ہے اور جیت جاتا ہے۔ راہگیر کو بھی شوق

ہوتا ہے ایک روپیہ لگاتا ہے جیت جاتا ہے پھر دو چار روپیہ ہار کر چلا جاتا ہے اسکے جانے کے بعد یہ لوگ بھی وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اس کے موجد بھی میر غلام عباس ہیں مزا یہ ہے کہ خود کبھی ایسے کھیل کے مرتکب نہیں ہوتے مگر مکر و فریب و دغا میں انکی سی عقل کسی کو نہ تھی آپ جو کام کرتے تھے فوجداری کے قانون سے بچکر اس عقلمندی کے سبب زندگی بھر راحت سے بسر ہوئی مگر مزاج میں فیاضی اور رحمدلی بہت تھی۔

ایک صاحب کہتے ہیں یہ تو ہماری آنکھوں کی دیکھی بات ہے کہ ایک دن میر صاحب گھر سے نکلے تو ایک آدمی لنگی لیے جارہا تھا آپ نے اُسے پکڑ لیا۔ اور کہا ابے کیا لیے جاتا ہے وہ چلّا تھا اُس نے کہا اُستاد گرم گرم گلگلے ہیں، اس نے کچھ انکی بھی نذر کیے میر صاحب نے سب دوست احباب کو بانٹ دیے وہ گلگلے ہم نے بھی کھائے تھے۔

یہ تو خاص بات ہے جس محلہ میں میر صاحب رہتے تھے وہاں کبھی چوری نہیں ہوئی آپ کی تعریف یہ ہے کہ جس قفل پر لات مارتے تھے وہ ٹوٹ جاتا تھا لنگور کی طرح چومنزلے مکان پر چڑھ جاتے تھے۔

پکی دیوار پر اس طرح پاؤں رکھتے تھے جیسے کوئی کھرنجے پر چھپکلی کی طرح دیوار میں چمٹ جاتے۔

انگریزی زمانے میں کبھی نہ وہ گرفتار ہوئے نہ قید ہوئے مگر بدنام بہت تھے۔ غدر کے بیس برس بعد تک تو زندہ تھے اسکے بعد مر گئے سُنا جاتا ہے کہ تال کٹورے کی کربلا لکھنؤ میں دفن ہیں۔

اک مرا دل اور اک برقِ تپاں بدنام ہے

(از جناب سید علی منظر صاحب کلیم لکھنوی)

بند آنکھیں ہو رہی ہیں نزع کا ہنگام ہے
موت کے پیغام کا آنا دلیلِ شام ہے

ترکِ الفت میں بھی مشکل عاشقی میں بھی ضرر
تیرا دیوانہ جہاں میں ہر طرح بدنام ہے

وہ یہ کہتے ہیں کہ اب تو نزع کی الجھن نہیں
سچ بتا دے مرنے والے تجھکو کچھ آرام ہے

درد نے کی ختم آخر داستانِ زندگی
دل کی میت کا اُٹھانا حسرتوں کا کام ہے

تیغ قاتل کی تڑپ کو کوئی کچھ کہتا نہیں
اک مرا دل اور اک برقِ تپاں بدنام ہے

ہجر کی شب جھلملاتا سا نظر آتا ہے کچھ
میری نظروں میں وہ تارا بھی چراغِ شام ہے

ہائے کچھ اس بیکسی سے میں نے دم توڑا کلیم
میری حالت دیکھنے والوں میں اک کہرام ہے

تحائف عید

(از جناب ابوالبیان مائل لکھنوی)

جناب ایڈیٹر صاحب تسلیم - نظارہ کا عید نمبر تحفہ نظم و نثر کا طالب ادر یہاں ایک نہ دو مسلسل تیس ۳۰ روزوں کی بدولت دماغ تہی دست ادھر دن بھر سگرٹ اور دیا سلائی کے اتصال کو ترستے ترستے اب یہ چیزیں یہاں کسقدر عزیز و محبوب ہیں - ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا لہذا بحکم لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط (تم ہرگز ہرگز نیکی کے درجے تک نہ پہونچو گے جب تک کہ اُن چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جو تمھیں محبوب ہیں) سگرٹ مع دیا سلائی حاضر خدمت ہے قبول فرمائیے -

(ابوالبیان مائل لکھنوی)

(آج ۷ جنوری کو افطار کے وقت محترم دوست مائل صاحب کے یہ دونوں تحفے (سگرٹ و دیا سلائی) وصول ہوئے - اور تنہا نہیں بلکہ مع آیت کے جس سے ہم نظارہ کا روزہ افطار کرتے ہیں لیکن اگر مائل صاحب بجائے سگرٹ کے لیبی بیڑیاں محبوب کمپنی کی بنی ہوئی بھیجتے تو شاید روزے کے ثواب میں بھی اضافہ ہو جاتا - ایڈیٹر)

"سگریٹ"

گو کہ سگرٹ ہے بظاہر ایک معمولی سی چیز
غور کے قابل ہیں لیکن اس کے پہلو بیشمار

اہل مغرب نے ہماری مشرقی اک چیز کو
حُسن صنعت سے دیا ہی اپنے کس درجہ سنوار

فکر و غم سے جبکہ تھک جاتا ہے انساں کا دماغ
تو پیا کرتے ہیں اکثر اس کو اہل کاروبار

باعث جمعیت خاطر ہے اہل فکر کو
غور کرتے وقت مٹ جاتا ہی اس سے انتشار

دل جلوں کے واسطے یہ اک غنیمت چیز ہے
اسکے پینے سے نکل جاتا ہی کچھ دل کا بخار

اسکے ہر کش سے نکلتا ہی جو اک دودِ لطیف
آئینہ سے قلب کے اُٹھتا ہے یہ گویا غبار

یا دل عشاق کی آہوں کا مجموعہ ہی یہ
جو رسائی کے لیے جاتا ہی سوئے کوئے یار

یا فضائے قلب صافی کی مصفّا گرد ہے
جو بگولے بن کے اُڑتی ہی فضا میں بار بار

طور دل پر یا چمک ہی شعلۂ ایمن کی یہ
مادّی عالم کا جسپر چھا گیا ہے کچھ غبار

ایک پہلو اور بھی سگرٹ کا روشن تر یہ ہے
یعنی تنہائی میں ہے انسان کا یہ غمگسار

جب طبیعت آپکی وحشت سے گھبرانے لگے
آپ اس ناچیز شئے کو پائیں گے خدمتگزار

اور پھر خدمت بھی کیسی شوق و دلسوزی کے ساتھ
پھونک دیتا ہے یہ اپنے آپ کو پروانہ وار

آپ کی خاطر مٹایا اس نے اپنے آپ کو
اس کی قربانی سے آیا آپکے دل کو قرار

خود فنا ہوکر پڑھایا اس نے یہ زرّین سبق
اسطرح رسمِ محبت میں رہو تم اُستوار

خاک ہو جاؤ ملا دو اپنی ہستی خاک میں
جب تمھیں کچھ زیب دیگا ادّعائے حُبّ یار

پیچ و تاب اسکے دھویں کے بھی ہیں معنی آفریں
سیکھ سکتا ہے بہت کچھ ان سے مرد ہوشیار

وہ بتاتے ہیں کہ عالم ایک حادث نقش ہے
جسکو لمحہ بھر نہیں ہے ایک حالت پر قرار

دیکھتے ہو جن مناظر کو تم اپنی آنکھ سے
کل نہ ہوگی حافظے تک میں بھی انکی یادگار

روح فرسا کل وہی ہونگے تمھارے واسطے
آج جن حالات کو سمجھے ہوئے ہو سازگار

سب خیالی نقش مائل ایکدن مٹجائیں گے
جیسے سگرٹ کے دھویں کے بنگئے نقش و نگار

دیاسلائی

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی

اک سجدہ میں خاک کردیا ہستی کو
مائل تم سے دیاسلائی اچھی

اپنے پیسہ کی عید

(ازجناب بشیرالدین صاحب بشیر فاضل و کامل سریاوی)

(خاص نظارہ کیلئے)

سلیم نیک سیرت پاک باطن حیدرآباد کے ایک متمول خاندان کا چشم و چراغ تھا وہ صورتاً سیرتاً ہر حیثیت سے حسین تھا اسکی تعلیم بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی یعنی وہ ایم۔اے کا طالبعلم تھا۔ اسکے والدین کا انتقال حال ہی میں ہوا تھا لہذا وہ بہت زائد رنجیدہ رہا کرتا تھا۔ اسکے چچا کریم بجائے اسکے کہ اسکی دلدہی کرتے اس سے سخت متنفر تھے کیونکہ اُن کے مرحوم بھائی (سلیم کے باپ) نے مرتے وقت کوئی اثاثہ نہ چھوڑا۔ اب سلیم بار خاطر تھا۔ اس کے چچا کا طرز عمل بہت ا(ز)ندتکلیف دہ تھا۔ اُس گھر میں دلدہی کرنے والی محض ایک ہی ذات تھی اور وہ اسکی چچازاد بہن شکیلہ تھی۔ شکیلہ ایک بہت حسین لڑکی تھی وہ بلا کی متین اور سمجھدار تھی اسکو سلیم سے محبت ہی نہیں تھی بلکہ عشق تھا۔ سلیم اس حقیقت سے قطعی ناواقف تھا۔ اسکو شکیلہ سے محبت ضرور تھی مگر پاک۔ سلیم کا دل اپنے چچا کی سختیوں کے باعث اب تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔ اسلیے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اسکو اپنے چچا کا گھر چھوڑ دینا چاہیے اس نے اپنے اس ارادہ کا ذکر شکیلہ سے کیا۔ وہ رونے لگی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ محبت کی آگ ایک دل سے دوسرے دل تک بہت جلد پہونچ جاتی ہے اسلیے سلیم کا دل شکیلہ کی محبت سے چھلک گیا۔

ماہ صیام کا اخیر زمانہ تھا اور عید کیلئے ہر چھوٹے بڑے کا دل بیچین تھا۔ کریم نے ہر متنفس کے لیے نئے کپڑے بنوائے لیکن صرف سلیم ہی کی ایسی ذات تھی جو اس موقع پر نظرانداز کر دی گئی۔ سلیم کو اس بے اعتنائی سے تکلیف ضرور ہوئی لیکن وہ اب نا سمجھ نہیں تھا۔ اس نے اسکی پرواہ بھی نہ کی پھر بھی اسے اک قسم کی تکلیف ضرور تھی اس موقع پر اُسے اپنے مرحوم والدیاد آئے جو عید کے موقع پر اپنی وسعت سے زیادہ اسکے کپڑے تیار کرواتے تھے۔ عین عید کے روز اسکے چچا نے کہا۔ میاں صاحبزادے افسوس ہے کہ آپکے اباجان کچھ چھوڑ کر نہیں مرے نہیں تو آج آپ بھی زرق برق نظر آتے۔ اس کا لہجہ انتہائی طعن آمیز تھا۔

سلیم نے اسکا کوئی جواب نہیں دیا۔ آج اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے چچا کا گھر چھوڑ دے گا۔ اور وہی ہوا یعنی شب کی گاڑی سے وہ بلا اطلاع کسی شہر کو چلا گیا۔ روانگی کے وقت اُس کی جیب میں صرف پانچ روپیے کچھ آنے تھے۔

اس نے اپنے سرہانے دو رقعہ چھوڑ دیے تھے۔ ایک اپنے چچا کے نام دوسرا شکیلہ کے نام جو حسب ذیل تھے۔

عم نامدار تسلیم قبول فرمائیے۔ آج یوم عید ہے اور ہر شخص مسرور ہے۔ بقول آپکے ابا جان مرحوم اتنا روپیہ چھوڑ کر نہیں مرے کہ مجھے بھی مسرت میں کچھ حصہ ملتا۔ لہذا میں اب اپنے پیسے کے تلاش میں جاتا ہوں۔ اولاً تو آپ کو میری تلاش کی ضرورت نہیں کیونکہ خس کم جہاں پاک اور بفرض محال اگر آپ کا ایسا ارادہ بھی ہو تو زحمت نہ فرمائیے گا کیونکہ میں اپنا نام نشان پوشیدہ کرنے کے بعد اس زندگی کے ایام

گزاروں گا فقط آپ کا بار خاطر سلیم۔

دوسرا خط بھی حسب ذیل تھا۔

اچھی بہن جیتی رہو۔ آج میں رخصت ہوتا ہوں اور غالباً ہمیشہ کیلئے اس گھر میں صرف تمھاری ہی ایک ایسی ذات تھی جو مجھپر مہربان تھی لہذا یہ لکھنا غلط نہوگا کہ مجھے صرف تمھاری جدائی کا ملال ہے۔ خدا کرے تمھارا ساتھ کسی اچھے کا ہو جائے اور تم اپنی زندگی عیش میں گزاردو۔ تمھارا دعا گو بھائی سلیم۔

صبح کو خط ملنے کے بعد کریم نے کوئی کوشش دنیا کے دکھانے کے لیے بھی نہ کی بلکہ اُنکو ایک قسم کی سبکدوشی ہوگئی ہاں شکیلہ البتہ بیحد روئی۔ سلیم حسب وقت دہلی پہونچا اسکے پاس ان پانچ روپیوں میں کُل دو روپیہ تھے۔ اب اسکو پہلے فکر معاش کی ہوئی۔ وہ سرائے میں مقیم ہوا اور بھٹیاری کے ذریعہ سے اس نے شہر کے تمام کمال حالات معلوم کر لیے۔ بی بھٹیاری نے اس سے کہا کہ یہاں ایک بڈھے مسلمان رئیس رہتے ہیں ان کے یہاں ایک خدمتگار کی ضرورت ہے سلیم نے بلا کسی خیال کے وہاں کی ملازمت قبول کرلی

۲

سلیم کو ملازمت کرتے ہوئے چھ مہینہ گزر گئے اس عرصہ میں وہ اپنے مالک کی ناک کا بال ہوگیا۔ اسکی وجہ یہ تھی خاں صاحب (اسکے مالک) پرانے قسم کے رئیس تھے اور بیحد پابند صوم وصلوٰۃ۔ سلیم چونکہ تعلیم یافتہ تھا ہمیشہ اُنکا ادب اور احترام کرتا تھا اور انکی راحت کا خیال رکھتا تھا۔ دوسرے اسمیں چوری کی عادت بالکل نہ تھی جو عموماً ملازموں میں ہوا کرتی ہے۔ سلیم نے اپنی دوران ملازمت میں یہ محسوس کیا کہ خاں صاحب بیحد مقروض ہیں اور اسکی وجہ یہ تھی کہ نائب صاحب جنکے متعلق زمینداری و نیز گھر کا انتظام تھا بیحد چالاک تھے وہ خاں صاحب کی تقریباً کُل آمدنی سرقہ کرلیا کرتے تھے جسکی وجہ سے بار ہمیشہ زائد ہوتا جاتا تھا۔ اسکو خاں صاحب کی ذات سے بیحد ہمدردی تھی۔ خاں صاحب اپنے سن وسال کے مطابق تمام افکار سے بے نیاز ہوکر صرف یاد الٰہی میں بسر کرنا چاہتے تھے دوسرے وہ لاولد بھی تھے اس لیئے ان کو دولت کس کے واسطے چھوڑ کر جانا تھی وہ خواہ مخواہ کی جدوجہد کر کے جائداد محفوظ کرتے۔ اور نہ اُنکو نائب صاحب کے ہتھکنڈوں کا علم تھا وہ صرف انگوٹھا بنا دینا جانتے تھے۔

ایک دن ایک تار آیا۔ خاں صاحب پُرانی وضع کے تھے۔ گھبرا گئے۔ وہ تار پڑھوانے کے لیے کئی جگہ بھیجا گیا لیکن اتفاق سے کوئی انگریزی داں نہ ملا۔ سلیم بازار کچھ سودا لینے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اسکی واپسی پر خاں صاحب نے کہا:۔

بھئی خدا کے لیے یہ تار کسی سے پڑھواؤ۔ میری طبیعت پریشان ہو رہی ہے۔

سلیم نے عادتاً وہ تار کھول لیا اور پڑھ دیا۔ میں شام کی گاڑی سے پہونچوں گا۔ حفیظ الرحمٰن۔

خاں صاحب اُچھل پڑے حفیظ الرحمٰن اُن کے حقیقی دوست تھے۔ انھوں نے استعجاب سے پوچھا:۔

کیا تم انگریزی جانتے ہو۔ سلیم نے اپنا سر جھکا لیا اور خاموش ہو رہا۔ شام کی گاڑی سے حفیظ الرحمٰن آئے۔ انکے استقبال کے لیے سلیم ہی بھیجا گیا۔ شام کو کھانے کے بعد خاں صاحب نے تمام و کمال واقعات بیان کرتے ہوئے سلیم کی بیحد تعریف کی اور یہ بھی بتایا کہ وہ انگریزی داں ہے۔

بھائی جان حفیظ نے کہا۔ اسمیں کوئی راز ہے۔ صورتاً و سیرتاً سلیم ایک شریف زادہ معلوم ہوتا ہے۔ خدا جانے کیا وجہ ہے کہ وہ ایسی ذلیل ملازمت کر رہا ہے۔ اگر فرمائیے (خاں صاحب نے سر کھجاتے ہوئے کہا) تو میں دریافت کروں۔ یہ آپ کا فرض ہے حفیظ نے جواب دیا۔ سلیم بلوایا گیا۔ سلیم سے خاں صاحب نے کہا۔

میں تم کو اپنے نمک کی قسم دیتا ہوں کہ تم اپنا کُل راز مجھے بتا دو۔ اب سلیم کو کوئی چارہ نہ تھا اس نے اپنا تمام راز سربستہ خاں صاحب سے بیان کر دیا اور اپنے شکوک بھی نائب صاحب کے متعلق بیان کر دیے۔

دوسرے دن محاسبہ ہوا اور نائب صاحب کے ذمہ اس سے کہیں زائد کی رقم نکلی جتنا کہ بار خاں صاحب کے ذمہ تھا۔ خاں صاحب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

(۳)

کسی نے سچ کہا ہے "ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں"۔ سلیم کے چچا کریم کا یکایک دیوالہ نکل گیا۔ اور سلیم کی علحدگی کے صرف دس ماہ کے بعد وہ پیسہ پیسہ کو مفلس ہو گئے۔ اور اسی کوفت میں مر بھی گئے۔ اب شکیلہ غریب بے والی وارث ہو گئی۔ اسکے دل میں ابتک سلیم کی یاد بدستور تھی۔ اور سلیم کو خاں صاحب نے اپنا متبنٰی کر لیا تھا۔ اور اب سلیم بہت اچھی حالت میں تھا۔ وہ خاں صاحب کی جائداد کا نائب بھی تھا۔ سلیم کو شکیلہ کا خیال آیا اور وہ دو روز کی اجازت لے کر وطن کی طرف روانہ ہوا۔

ماہ صیام پھر آ چکا تھا اور وہ اس دن اپنے چچا کے گھر پہونچا جسدن کہ شکیلہ کو چوتھا فاقہ تھا۔ گھر میں سوائے اسکے کوئی متنفس نہ تھا۔ شکیلہ غریب پردہ نشین عورت کہاں جاتی کہاں آتی۔ گھر میں بیٹھی خدا کو یاد کر رہی تھی ہر عزیز ہر ملازم روپیہ نہ دیکھ کر اس سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ سلیم نے دروازے پر دستک دی۔ ڈرتے ہوئے شکیلہ نے دروازہ کھولا اور سلیم بھائی کہہ کر لپٹ گئی۔ تمام واقعہ سُننے کے بعد سلیم نے کہا۔ شکیلہ اب یہ مکان چھوڑو اور اپنے گھر چلو۔ شکیلہ کو کیا عذر تھا وہ اس وقت اس کے ساتھ ہوئی اور دہلی ... پہونچی۔ خاں صاحب نے بیحد خاطر اور مدارت کی۔

اب کی سال گزشتہ کی طرح یوم عید آیا۔ لیکن اب کی مسرت کا جھنڈا لہلہا رہا تھا اور اسکی وجہ یہ تھی کہ اپنے پیسہ کے علاوہ سلیم کو وابستگی ایک ایسی ہستی سے ہو رہی تھی جو محبت کی دیوی تھی۔ خانصاحب نے سلیم کی شادی شکیلہ کے ساتھ اسی عید کے دن کر دی۔

وہ گوری گوری باہیں

از جناب محمود الحسن صاحب کیفؔ

جو زینت جہاں ہیں جو دل کا آسرا ہیں بے عیب بے گماں ہیں ایمان مدعا ہیں
اللہ پھر دکھادے وہ گوری گوری باہیں

جو جان عاشقی ہیں تسکین قلب مضطر جو وجہ زندگی ہیں سارے جہاں سے بہتر
اللہ پھر دکھادے وہ گوری گوری باہیں

جن پر نثار دُنیا جو حُسن کی ہیں زینت جن سے بڑھا ہے سودا جن سے ہے کُل مسرت
اللہ پھر دکھادے وہ گوری گوری باہیں

دلچسپ دلفریبی وہ چوڑیوں کا منظر اور اس پہ جامہ زیبی اک حسن ہے سراسر
اللہ پھر دکھادے وہ گوری گوری باہیں

اب خون رو رہا ہوں دل مضطرب ہے غم سے دامن بھگو رہا ہوں اپنی ہی چشم نم سے
اللہ پھر دکھائے وہ گوری گوری باہیں

روتا ہے بیکسی سے صدموں کو سہ رہا ہے عاری ہے زندگی سے یہ کیفؔ کہہ رہا ہے
اللہ پھر دکھادے وہ گوری گوری باہیں

گذارش - جو حضرات نظارہ نمبر (۱) و نمبر (۲) سے خریدار ہیں اس نمبر کے بعد ان کا چندہ ادا ہو جائیگا لہٰذا یا تو وہ بذریعہ منی آرڈر چندہ سالانہ ارسال فرمائیں یا ایک کارڈ لکھکر خریداری یا عدم خریداری کی اطلاع دیدیں ورنہ آئندہ پرچہ بذریعہ وی پی آئے گا جس کا وصول کرنا ان کا اخلاقی فرض ہوگا - تابش (منیجر)

بے زبان مہر آموز

(از حضرت ہدف اجتہادی)

یا اللہ! یہ آج کیا ہے جو برسات کے اس سہانے منظر میں "نور جہاں" اکیلی دکھائی دیتی ہے قلعۂ معلی کی ساون بھادوں پر چھائی ہوئی متوالی او گھنگھور گھٹاؤں میں اسکی ساتھ والیاں کہاں چلی گئیں۔ کیا کہیں جھولا جھول رہی ہیں؟ تو پھر نور جہاں وہاں کیوں نہ گئی اور ان کے گانے کی آواز کیوں نہیں آتی۔ اس کا اطمینان تو بتا رہا ہے کہ سب کی سب یہیں ہیں۔ اسکی آس پاس گھوم گھوم کے بھٹکنے والی نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ کسی کی تلاش ہے۔ شاید "چھلی چھلیا"[۵۱] ہو رہی ہے اسکی ہمجولیاں باغ کی جھاڑیوں میں چھپی ہونگی، یہ انھیں کو چھونے کی تاک میں ہے۔ مگر کبتک اندھیرا ابھی ہوتا جاتا ہے۔ سورج اسکے نورانی چہرہ سے شرما کے ڈوبنے کو ہے کہیں اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی کی کڑک یا بادل کی گرج سے معصوم دل سہم نہ جائے، مگر نہیں وہ تو مسکرا رہی ہے شاید چھپنے والیوں سے کسی کو دیکھ پایا! ٹھیک تو ہے وہ کیا چمنوں میں کوئی دوڑ رہا ہے۔ مگر یہ تو مرد ہے، ارے شہزادہ، ہاں ہاں شہزادہ سلیم۔ کسی چیز پر ہاتھ مارتا ہے جب ہاتھ خالی جاتا ہے تو اسکے پیچھے دوڑتا ہے۔ کوئی پرند ہے جو اسیر الینا چاہتا ہے، کچھ دور اڑتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے، شہزادہ ہے کہ پریشان کیے ہے، وہ اس نے پھر ہاتھ مارا، وہ نور جہاں پھر مسکرائی، کہ خالی گیا۔ مگر نہیں، ابکی سلیم فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ زمین سے اٹھا۔ اس نے دوڑنے کے عوض میں وہیں تھم کے پہلے فضائے باغ پر متجسس نگاہ ڈالی اب مسکراتا ہوا نور جہاں کی طرف آرہا ہے اور نور جہاں الٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہی ہے سلیم کے قدم تیز ہوئے، نور جہاں نے پیٹھ موڑی، سلیم درخت کی آڑ میں آگیا، نور جہاں بھاگی سلیم نے دیکھ لیا، نور جہاں کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا، "کون بھاگا جا رہا ہے ٹھہرو"،

الفاظ تحکمانہ تھے نور جہاں وہیں ٹھہر گئی۔ سلیم نے قریب آکے کہا، "مہر النسا! تم ہو؟ اچھا تو ذرا یہ کبوتر لیے رہو، میں کبوتری کو بھی پکڑ لاؤں، رات ہونے کو ہے کہیں غائب نہ ہو جائے"۔

نور جہاں نے شرمائی ہوئی نگاہوں سے سلیم کو دیکھا اور چپکے چپکے ہاتھ بڑھا کے کبوتر لے لیا۔ سلیم اپنی دھن میں فوراً پلٹا اور دو چار قدم تک تو نور جہاں کو صرف اس کے پاؤں دکھائی دیے پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا کیونکہ کبوتر ہاتھ میں آنے کے بعد اسکی نظریں بھی زبان کے متوحش چہرہ پر جم گئی تھیں۔ کبوتر کے دھڑکتے ہوئے ننھے سے کلیجے اور جلد ہی جلدی پھرتی ہوئی یاقوتی آنکھوں نے نور جہاں کے

۵۱۔ چھلی چھلیا۔ ایک کھیل کا نام ہے۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو کر کھیلتے ہیں۔ ایک چور بنتا ہے اور سب شاہ۔ جو چھونے دوڑتا ہے شاہ بھاگتے ہیں چھپتے ہیں۔ انہیں سے جسے چور چھو لے وہ چور ہو جاتا ہے اور یہ چور شاہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ چھونے دوڑتا ہے اور سب بھاگتے ہیں اسی طرح جبتک جی چاہتا ہے کھیلتے ہیں۔ (لکھنؤ)

نازک دل میں رحم پیدا کر دیا اور اُس نے میرا بے زبان" کہہ کے پھر کبوتر کو سینہ سے لگا یا اور دیر تک لگائے رہی پھر لوپے پولے ہاتھوں سے رو کے ہوئے چہرہ تک لائی اور کبوتر کے نرم نرم پروں پر پیار سے مُنھ رکھدیا۔ اُسوقت نورجہاں کے بند ہونٹوں سے ایک خفیف سی آواز نکل رہی تھی" ہوں ہوں ہوں ہوں" اور اُسکا خوبصورت جسم ایک ہی جگہ پر دہنے بائیں اسطرح حرکت کر رہا تھا جیسے مائیں اپنے بچوں کو بہلاتی ہیں۔

نورجہاں کا پیار جو بڑھتا جاتا تھا گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی تھی۔ وحشت زدہ نو گرفتار اسکا احساس کرکے زور سے پھڑکا، نورجہاں نے ڈر کے کانوں کی طرف دونوں ہاتھ سمیٹے، کبوتر آزاد ہوگیا۔

جو ذرا دیر پہلے گرفتاری کی تکلیف سے اُلٹی سیدھی سانسیں لے رہا تھا اب فضا میں خوشی کے تاوے کاٹ رہا ہے اور نورجہاں حیرت سے مُنھ کھولے دیکھ رہی ہے، کبوتر جس جس طرف اُڑتا ہوا جاتا ہے نورجہاں کی گھبرائی ہوئی نگاہیں اُس کے ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔

نورجہاں کا بس چلتا تھا کہ اپنی ساحر نظروں سے کبوتر کو جاذب کرلے، مگر محال فوراً ممکن کیونکر بنجائے، کاش کبوتر کے سینہ میں انسانی دل ہوتا۔

وہ گھبرا گھبرا کے کبھی اِدھر اُدھر دیکھتی ہے کبھی کبوتر کی طرف کہ شہزادہ آ پہونچا، نورجہاں کا چہرہ زرد ہوگیا۔ سلیم کے ہاتھوں میں کبوتری ہے باچھیں کھلی ہوئی اور چہرہ خوشی سے جگمگا رہا ہے، اس نے قریب آکے کہا" لو میں کبوتری کو بھی پکڑ لایا"

نورجہاں نے ڈرتے ڈرتے دونوں ہاتھ بڑھائے سلیم نے کبوتری حوالہ کی مگر ساتھ ہی دونوں ہاتھ خالی دیکھ کے کہا۔

"ہائیں! کبوتر کیا ہوا"

نورجہاں کی نظریں زمین پر گر گئیں، چہرہ پشیمانی سے سُرخ ہوگیا۔

"جواب دو، چپ کیوں ہو"

نورجہاں کی گردن اور جھک گئی۔

"کچھ مُنھ سے تو کہو آخر کیا ہوا"

نورجہاں کی کمر میں خفیف سا خم آگیا اور وہ اپنے بائیں پاؤں سے سبزہ کو ٹھکرانے لگی۔

"مہر النسا! میں پوچھ رہا ہوں"

"وہ...... تو...... اُڑ گیا" نورجہاں نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"اُڑ گیا؟ کیونکر"

نورجہاں پھر خاموش تھی۔

"پھر چپ ہوگئیں، آخر بتاؤ تو بات کیا ہوئی"

نورجہاں نے گردن اونچی کی جواب دینے کے لیے منھ کھلکے رہ گیا۔

"ہاں ہاں، کہو........ پھر نہیں بولتیں"

نورجہاں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے شہزادہ کو دیکھا اسوقت اسکے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"ڈرو نہیں، جو واقعہ ہو صاف صاف بتا دو"

نورجہاں نے شہزادہ کو کنکھیوں سے دیکھا اور نظر نیچی کرلی۔

"مہرالنسا کچھ کہو! آخر مجھے بھی تو معلوم ہو"

نورجہاں کے ہونٹوں کو حرکت ہوکے رہ گئی۔

"کیا، پھر کہو! میں نے نہیں سُنا"

"ہاں تو کبوتر اُڑ گیا"

"یوں" نورجہاں نے ہاتھوں کو کھول دیا۔

کبوتری بھی پھڑپھڑاکے وہیں پہونچی جہاں کبوتر اُڑ رہا تھا کبوتر نے خوشی میں کبوتری کا ٹاوا کاٹا، کبوتری نے سر نیچا کر کے کبوتر کا ٹاوا کاٹا دونوں ایک دوسرے پر قربان ہونے لگے۔

نورجہاں کے اس بھولے پن پر شہزادہ سلیم کا دل پھڑک گیا وہ محبت کی مسرت آمیز نگاہوں سے نورجہاں کو دیکھ کے مسکرایا، نورجہاں شرمیلی نظروں سے دیکھ کے سمٹی اور گردن جھکالی۔

شہزادہ کو کبوتروں کی محبت پر رشک آگیا۔ اس نے پہلے بھی نورجہاں کو دیکھا تھا مگر آج اس کے دل کی نگاہوں میں وہ اور ہی نورجہاں تھی۔

ضروری تصحیح اسی پرچہ کے صفحہ ۱۴ پر "دعائے سند" حضرت زاہر لکھنوی کی غزل میں پریس کی غلطی سے بعض فردوں میں حسب ذیل غلطیاں ہوگئی ہیں ناظرین تصحیح فرمالیں۔

مطلع کے پہلے مصرعہ میں بجائے "کس" کے "کسی" ہونا چاہیے۔ اور اسی مطلع کے دوسرے مصرعہ میں بجائے "حلقہ" کے "حلیہ" ہونا چاہیے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "پہلے" کے بجائے "پہلے سے" ہونا چاہیے۔ چوتھے شعر کے آخری مصرعہ میں "شمع" کے بجائے "ہر شمع" ہونا چاہیے۔ آخری شعر کے پہلے مصرعہ میں "میرا ہوئی" کے بجائے "میرے لہو کی" ہونا چاہیے۔ ایڈیٹر

درسِ محبّت

از مشہور ناول نگار مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی

جوڑا کبوتروں کا ایک بیٹھا تھا اک درخت پر — بوٹے وہ سبز و نیلگوں اور زمردیں وہ پر
گنڈے وہ صاف اور سفید جیسے ہو چرخ پر ہلال — ایک پری کی شکل کا دوسرا حور کی مثال
آنکھوں میں نور کی چمک دل میں سرور کی جھلک — لطف فزائے باغ تھی اُن کی زبان کی چہک
خوف نہ باغباں کا تھا اور نہ شکاریوں کا ڈر — گونج رہے تھے شاخ پر بیٹھے ہوئے وہ بے خطر
آیا تھا سیرِ باغ کو نورِ نگاہِ شہریار — چشم و چراغ ہند کا یعنی سلیم نامدار
پھرتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھتا تھا بہار باغ — چہچہہ زن تھے باغ میں چار طرف ہزار باغ
دل میں اُمنگ، سر میں جوش اور بڑھا ہوا شباب — جیسے پیے ہوئے کوئی بادۂ تیز مشک ناب
پڑ گئی ناگہاں نظر طائرِ مشک رنگ پر — شوق نے صید افگنی چاہی اُسے اُبھار کر
دونوں بہم تھے شاد و شاد محوِ نیاز، مستِ ناز — چپکے سے شاہزادہ نے دستِ ہوس کیا دراز
اُڑ گئے دونوں ایک بار اپنے پروں کو تول کر — سامنے کی روش کے پار بیٹھے پھر ایک شاخ پر
پھر وہی صحبت نشاط، پھر وہی ذکرِ دلنواز — پھر وہی خوش ادائیاں، پھر وہی راز اور نیاز
دوڑ کے شاہزادہ پھر پہونچا وہاں بھی ناگہاں — دونوں طیور شاد و خوش بیٹھے تھے شاخ پر جہاں
ہلنے سے برگ و بار کے کھٹکا ہوا اُنھیں اُدھر — اُڑ گئے تول تول کے بازوؤں کو وہ تیز پر
جاتا تھا اُنکے ساتھ ساتھ آپ سلیم دوڑ کر — باغ میں اُڑتے پھرتے تھے دونوں طیور ادھر اُدھر

"جہانگیر و نورجہاں"

ہو گیا صید ناگہاں دونوں میں ایک تھا جو نر
رہ گیا پھر پھڑا کے وہ چھوٹی سی چونچ کھول کر

باغ میں شاہزادہ کے ساتھ نہ تھا کوئی امیر
دیکھے جسے وہ پہلا صید دوسرے کو کرے اسیر

تھا اسی فکر میں ہنوز نورِ نگاہ بادشاہ
ناگہاں اتفاق سے ایک طرف گئی نگاہ

دیکھتا کیا ہے باغ میں نورجہاں ہے جلوہ زا
مہر بھی جس کے حسن کے سامنے آکے ماند تھا

اُف وہ کرشمہ سازیاں اُسکے ضیاءِ حسن کی
جھٹپٹے وقت باغ میں پھیلی ہوئی تھی چاندنی

کنج چمن سے تھی عیاں عارض جانفزا کی تاب
سبزہ کے درمیان میں یا کہ کھلا ہوا گلاب

دے کے وہ طائر اسیر اُس کو سلیم نے کہا
دوسرا ابھی کروں گا صید اسکو لیے رہو ذرا

آتا ہوں میں ابھی ابھی جانا نہ تم کسی طرف
چھوٹ نہ جائے یہ کہیں دھیان رہے اسی طرف

صورت بوئے گل سلیم کنج سے جب نکل گیا
نورجہاں کے ہاتھ میں رہ گیا صید خوشنما

ڈھیلی گرفت پا کے وہ زور سے پھڑپھڑا اُٹھا
خوف سے یہ اُچھل پڑی صاف اسیر چھُٹ گیا

ہو کے ہوا وہ اُس طرف اُڑ گیا بام چرخ پر
دوسرے کو لیے سلیم اتنے میں آ گیا ادھر

دے کے کبوتری اُسے پوچھا کہ نر کہاں گیا
خوف سے کانپتے ہوئے اُس نے کہا کہ اُڑ گیا

پوچھا کہ کس طرح اُڑا ایں بھی تو ماجرا سنوں
نورجہاں نے اسکو بھی فوراً اُڑا دیا کہ "یوں"

آہ ادائے سادگی کچھ نہ سلیم کہہ سکا
روئے نگار کی طرف دیکھتا یوں ہی رہ گیا

مکتب عشق میں اُڑے ہوش و حواس اسطرح
نورجہاں کے ہاتھ سے پہلا اسیر جس طرح

خنجر ادیب حسن نے یوں دیا درس اولیں
ہو گیا ایک ایک حرف نقش کی طرح دلنشیں

حسینوں کی عید

از
(ابوالفرحت منشی بشاش لکھنوی)

یوں تو حسینوں کے لیے اس دُنیا کا ہر روز روزِ عید ہی اور ہر شب شبِ برات ہی کس دن وہ جاذبِ نظر اور دلفریب لباس میں ملبوس نہیں ہوتے۔

اُن کے پھولوں سے زیادہ نازک چہروں پر کس روز تازگی۔ رونق اور بشاشت کا خوشنما غازہ نہیں ہوتا۔ اُنکی فتنہ گر آنکھوں میں بے فکری کا سرمہ کب تک نہیں چمکتا اُن کی کبھی نہ بکھرنے والی دراز زلفیں کبھی بھی بکھریں۔ ان کے نازک لبوں پہ جلوہ ہائے تبسم کے سوا مُہرِ خاموشی کس نے دیکھی۔ وہ تو ازل سے خوش ہیں اور ہمیشہ خوش رہیں گے (خدا کرے وہ ہمیشہ خوش رہیں) کیا جانیں غم کسے کہتے ہیں اور سچ پوچھیے تو اس دُنیا کی حقیقی مسرتیں اور سچی خوشیاں انھیں کے لیے ہیں جنکی زندگی کا ہر لمحہ مسرت اور جن کا ہر نفس پیغامِ عشرت ہی۔ انکے پہلو میں دل ہی اور ایک ایسا دل ہی جسے غم والم سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ وہ لذت کشِ عیش ہے۔ درد آشنا نہیں ہے۔ عید کا دن ساری دُنیا کے لیے اک انوکھا دن ہے لیکن حسینوں کے لیے کچھ زیادہ قابلِ وقعت نہیں۔ اس لیے کہ آج کے دن کے تمام خصوصیات اُنھیں قریب قریب روز ہی حاصل ہیں۔ میرے نزدیک حسینوں کے لیے عید کا دن قدرتی طور پر گویا اُن کی عشرتوں اور مسرتوں میں ایک مزید اضافہ ہے۔ اُن کی اک سادگی ہی میں گو ہزاروں بناؤ ہوئے ہیں اُس پر گوناگون زینتیں رنگا رنگ آرائشیں گویا سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہیں۔ صبح ہوتے ہی ہر طرف آئینہ خانے کھل جاتے ہیں اور نماز خود پرستی انتہائے خضوع وخشوع سے ادا کی جاتی ہے۔ اس سے فرصت ملی تو زریں اور قیمتی لباس زیبِ جسم کیا گیا نقرئی وطلائی زیورات سے عزت بڑھائی گئی۔ عطر دان کھلے۔ اور چند ہی منٹ میں تمام لباس مع ریشمی رومال کے معطر ہو گیا ہونٹوں پر کو بہ شکن سُرخیاں دوڑ گئیں۔ دس بجتے بجتے ہزاروں دل پامال کرتے ہوئے سب عیدگاہ پہونچ گئے۔

کیا آج کے دن بھولے سے (کسی کے) دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا (کہ کوئی) بسترِ غم پر انتہائے مایوسی کے عالم میں کروٹیں بدل بدل کر موجودہ حیات پر موت کو ترجیح دے رہا ہے۔

(خدا نہ کرے)